دعوت اسلامی اور ہمارا طرز عمل

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

دعوت وتبلیغ کی اہمیت ہمیشہ سے مسلّم رہی ہے۔ ہر دور کے علماء اور رہنمایانِ ملت نے دعوت وتبلیغ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اسے اپنی اولین ترجیحات میں رکھا ہے۔ موجودہ عہد اس کا خصوصی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ مسلمانانِ عالم اس کی طرف متوجہ ہوں اور تمام ابنائے آدم تک کسی امتیاز وتفریق کے بغیر اسلام کی صاف وشفاف دعوت اور اس کے امن وخیر خواہی کے پیغام کو پہنچائیں۔ تاکہ اسلام اپنے ماننے اور چاہنے والوں کو جو بشارت وخوش خبری دیتا ہے، وہ بھی اس کے حق دار بن سکیں۔ زیرِ نظر کتاب ''دعوت اسلامی اور ہمارا طرزِ عمل'' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ 'دعوت اسلامی اور ہمارا طرزِ عمل' تحریک اسلامی کے نام ور اسکالر اور فکری رہ نما ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے ماہ نامہ زندگی نو کے لیے بہ طور اشارات (اداریہ) تحریر فرمائے تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر فریدی کے سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ جن کے عناوین اس طرح ہیں:

دعوت اسلامی

دعوت اسلامی اور ہمارا طرزِ عمل

تاریخ انسانیت اور قرآن کریم کا اعجاز

یہ وقت ایمان واستقامت کا ہے

کلمۂ حق کو اللہ کی تائید کا وعدہ

ایک بصیرت افروز حکایت عزیمت

وحدت کا سبق

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی نے اپنے ان مقالات میں اپنی معروف روش کے مطابق نہایت شرح وبسط اور کامل داعیانہ بصیرت کے ساتھ موجودہ حالات کے تناظر میں اسلام کی دعوت کی اہمیت وناگزیری کو واضح کیا ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے اور ایک داعی کے کردار اور اس کے رویے کی بھی نشان دہی کی ہے۔ 'ایک بصیرت افروز حکایت عزیمت' کے زیرعنوان مقالے میں میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس مقالے میں تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی حیات وخدمات کو علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر فریدی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی قبول عام حاصل کرے گی۔

ناشر

دعوت اسلامی

داعیانہ حکمت کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم پر غور وفکر کرنا ہوگا۔ قرآن کریم کی منشا کیا ہے، وہ انسانوں کو کس حقیقت کی معرفت کی دعوت دیتا ہے، اس نے رب کائنات کو کس حیثیت میں پیش کیا ہے، اس کی ترجیحات کیا ہیں، اس کے پیغام میں تنبیہ اور تبشیر کا تناسب کیا ہے، اس کی تعلیمات کی رو سے بنیادی حقائق کیا ہیں، جن پر انسان کی فلاح و خسران کا مدار ہے؟ ان تمام بنیادی سوالات کا جواب ہمیں قرآن سے حاصل کرنا ہوگا۔ قرآن کریم کے بعد داعی کی حکمت کا سرچشمہ محمد ﷺ کی سنت اور آپؐ کی زندگی ہے۔ اس کے بعد اس سرچشمہ نور کی روشنی میں داعی کو اپنے مخاطب کی نفسیات، اس کی معاشرت، اس کے عمومی ماحول، اس کی زندگی کی ضروریات اور مسائل پر غور کرنا ہوگا۔ اور پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ اس کلمہ حق کو کس طرح پیش کیا جائے کہ وہ نکھرا اور صاف شفاف نظر آئے، تمام انسانوں کے لیے رحمت کا پیغام بر بن جائے اور اس پر یہ پھبتی نہ چسپاں ہو سکے کہ یہ تو بس ایک مخصوص گروہ یا ایک طبقہ کے خیر و فلاح کا ضامن ہے۔ اس کی دعوت رب العالمین کی طرف نہیں بلکہ رب المسلمین کی جانب ہے۔

اس کلمہ حق کے داعی اعظم محمد ﷺ کی صفت، رحمت بتائی گئی ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ o (الانبیاء: ۱۰۷)

”ہم نے تو آپؐ کو ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

اس لیے آپ کی اقتدا میں یہ دعوت رحمت ہے اور اس کو اسی حیثیت سے پیش کرنا لازم ہے۔ اس ذمے داری کی ادائے گی یہ چاہتی ہے کہ داعی، انسانیت کا مخلص، ہم درد اور خیر خواہ ہو،

وہ بھٹکے اور ناواقف انسانوں کا کسی طرح استخفاف نہ کرے۔ دعوت حق کو اس طرح نہ پیش کرے کہ گویا وہ خود تو راست روی اور تقویٰ کے بلند مرتبے پر فائز ہے اور مخاطب فروتر ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں مرتبہ پر فائز کیا ہے۔ سب کے سپرد خلافت ارضی کا اعلیٰ منصب کیا ہے:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ (البقرہ:۳۰)

''اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس نے امانت ارضی تمام انسانوں کے سامنے پیش کی:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کو تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔''

رسول اکرم ﷺ سے فرمایا گیا:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ۝ۙ (المدثر:۶) ''اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے۔''

البتہ انسانیت عظمیٰ کے بہت سے گروہوں نے اس ذمے داری کی ناقدری کی۔ وہ راہ راست سے بھٹک گئے۔ بنا بریں ان کو تنبیہ کرنے والے، اپنی ذات میں دوسرے انسانوں سے برتر نہیں ہیں، بلکہ صرف نصح و خیر خواہی کا فریضہ ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ خوف اور تقویٰ ان کو پروردگار عالم کے نزدیک مکرم اور محترم ضرور قرار دیتا ہے، لیکن استکبار کے بہ جائے شکر گزاری اور عجز و انکسار سکھاتا ہے۔ انسانیت عظمیٰ کے لیے اخلاق اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت کسی فرد انسانی کا کارنامہ نہیں ہے، بلکہ توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِکَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ (الانعام:۸۸)

یہ اللہ کی ہدایت ہے، اس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں جس کی چاہتا ہے رہ نمائی کرتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا کہ آپ کی ذمہ داری پیغام حق پہنچانا ہے۔ اس لیے

آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ جس کو آپ چاہیں، اس کو توفیق ہدایت مل جائے گی:

اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج

(القصص:۵۶)

''(اے نبی) جس کو تم چاہو، اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

بندہ مومن کو ہدایت اور سبیل الرشاد تک اس کی رہ نمائی اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، لہٰذا یہ نعمت اس کو سجدہ شکر پر ابھارتی ہے، فخر وغرور کے جذبات نہیں پیدا کرتی۔

وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ج (الاعراف:۴۳)

''ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہماری رہ نمائی نہ کرتا۔''

چناں چہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توصیف میں جذبہ شکر کو خاص اہمیت دی ہے:

شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ ط اِجْتَبٰہُ وَ ھَدٰہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (النحل:۱۲۱)

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا، اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔

سپاس گزاری کا یہ غیر معمولی جذبہ، داعیان حق کے عمومی طرز عمل، ان کی دعوت کے انداز، لہجہ اور مخاطب کے ساتھ برتاؤ پر غیر معمولی اثر ڈالتا ہے۔ وہ دعوت حق کی صداقت پر غیر معمولی یقین رکھنے کے باوجود کسی غرور اور تمکنت میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اپنے جیسے انسانوں پر اپنی بڑائی قائم کرنے کے بہ جائے ان کے اور اپنے رب کی بڑائی کی طرف بلاتے ہیں۔ اس رب کائنات کی طرف، جو اپنی تمام مخلوق سے محبت کرتا ہے اور انھیں جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے بہترین تدابیر اختیار فرماتا ہے۔ اسی جذبہ خیر سے سرشاری کا نتیجہ یہ ہے کہ داعی حق کی زبان اور اس کا طرز خطاب انوکھا اور دل نشیں ہوتا ہے۔ یہ تعلیم اس کو قرآن کریم اور اسوۂ نبیؐ سے ملتی ہے۔

قرآن عزیز کا یہ ارشاد:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ:۳۳)

''اور اس شخص سے اچھی بات کس کی ہوگی، جس نے اللہ کی طرف بلایا، نیک عمل کیا اور کہا میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

حد درجہ جامع اور بلیغ ہے۔ جس میں ''قول حسن'' سے صرف اس کے معنوی حسن کی طرف اشارہ نہیں ہے، بلکہ طرز ادا بھی اس میں شامل ہے۔ صرف قول کا معنوی حسن اس کی قبولیت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو ادا کرنے کا طریقہ، اس کے الفاظ، اس کا چہرہ مہرہ اور اس کا اعتبار و کردار سب شامل ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (آل عمران:۱۵۹)

''(اے پیغمبر) اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو تاکید کی گئی کہ جبروت وقت اور ظالم عصر کو اس طرح مخاطب فرمائیں:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ (طٰہٰ:۴۴)

''اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔''

قرآن کریم اپنی توصیف میں فرماتا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ (الزمر:۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔ ایک ایسی کتاب، جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔''

دعوت حق ایک بشارت ہے

دعوت حق کوئی ایسی تنبیہ نہیں ہے کہ جس کو صرف ڈرانے، دھمکانے اور انسانوں کو خداوند کریم کا باغی قرار دینے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ نہ اللہ سبحانہ صرف قہار، جبار اور منتقم ہے، جو (معاذ اللہ) اس گھات میں بیٹھا ہو کہ کسی نے مجال سرتابی کی اور اس کو جہنم کے دردناک عذاب میں جھونک دیا۔ اس نے اپنے رسول کا مشن بیان کرتے وقت شاھد و مبشر کے الفاظ پہلے اور نذیر کا لفظ بعد میں استعمال فرمایا ہے۔ یہ دعوت حق ابتداءً بشارت ہے تمام گم کردہ راہ اور غافل انسانوں کو کہ ان کے پروردگار کا دامنِ رحمت وا ہے۔ نفس امارہ کی بیڑیوں سے چھٹکارا دلا کر وہ نفس مطمئنہ کا انبساط عطا کرنا چاہتا ہے۔ رسم، رواج اور جھوٹے خداؤں کی بندگی کے جس بوجھ سے ان کی گردن ٹوٹی جا رہی ہے، اس سے انھیں نجات دلانا چاہتا ہے۔ اور خدائے رحیم وکریم کی بارگاہ میں سر اطاعت خم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کے منصب کا بیان اس طرح فرمایا ہے:

وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۵۷)

ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے، جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

دعوت، کارِ نبوت ہے۔ یہ اپنے مخاطب انسانوں کو ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے مجرم گرداننے سے احتراز کرتی ہے اور جب تک پیغام حق ان تک پہنچ نہ جائے، اس وقت تک ان کے اخروی انجام کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے سے گریز کرتی ہے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اسی طرح جواب دیا تھا:

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰیo قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ
کِتٰبٍ ج لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَیo (طٰہٰ:۵۱-۵۲)

''(فرعون) بولا: اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں، ان کی پھر کیا حالت تھی؟ موسیٰ نے کہا: اس کا علم میرے رب کے ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔''

امتِ مسلمہ

بد قسمتی سے امت مسلمہ نے جب سے اپنے داعیانہ منصب پر قومی تفاخر کو ترجیح دی ہے، اس نے ان تمام امتیازات کو اختیار کر لیا، جن کی بنا پر انسانیت عظمیٰ کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ خوش قسمتی سے رنگ و نسل اور ذات پات کے امتیازات سے اگرچہ وہ بڑی حد تک محفوظ رہی، اس لیے کہ توحید الٰہ اور وحدت آدم اس کے عقیدے کی اساس رہی ہے۔ لیکن حکومت اور ریاست کی ضروریات نے اس کو ایک دوسری تقسیم سکھا دی۔ کافر، ذمی اور حربی کی تقسیم نے اس کو یہ بھلا دیا کہ وہ اصلاً قوم نہیں ہے، بلکہ ایک امت ہے، جس کی رو سے تمام انسان اس کی دعوت کے مخاطب ہیں۔ بہ حیثیت انسان، وہ سب بھائی بھائی ہیں، ایک ہی کنبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا فی ذاتہ نہ کوئی حقیر ہے اور نہ کوئی افضل ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت اس کے مادی ساز و سامان، اس کی تعداد یا اس کے عسکری جاہ و حشم سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کے اخلاقی اوصاف سے ملتی ہے۔ کلمہ حق کی قبولیت کی اولین شرط یہ ہے کہ داعی خوب اچھی طرح سمجھ لے کہ اس دعوت کی ابتدا توحید، رسالت اور آخرت سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی یہی عقائد ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا سلسلۃ الذہب (Galaxy) اس امر کا قطعی ثبوت ہے۔ اس لیے آج بھی دعوت صرف اور صرف دعوت الی اللہ ہے۔ اس کی غرض و غایت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ یہ کسی فرقہ، قبیلہ یا قوم کی برتری کی طرف نہیں بلاتی، نہ کسی خاص طرز معاشرت کی طرف اللہ کے بندوں کو پکارتی ہے۔ دنیوی مفادات کا حصول اس کا محور نہیں ہے، نہ انسانوں کی دنیوی قیادت اس کی غایت ہے۔

اس مرکزی نکتہ کو نظر انداز کرنے سے دعوت حق کی قبولیت میں مسلمانوں کی تہذیب اوران کا کلچر رکاوٹ بن سکتا ہے۔ تاریخ کے لمبے عرصے میں مسلمانوں نے تہذیب اور معاشرت کے جو متعدد مظاہر اپنائے ہیں، ان میں بعض دین حق کو اختیار کرنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں اور بن رہے ہیں۔ عربوں کا لباس اختیار کرنا نہ لازم ہے نہ شعار تقویٰ، شیروانی پاجامہ اور ٹوپی، جس طرح مسلمان استعمال کرتے ہیں، اسی طرح ہمارے ہندو بھائی اور بعض دوسرے برادرانِ وطن بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ اسلامی زندگی کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح خاص انداز کا دستر خوان اور مخصوص کھانے مسلمان تہذیب کی خاصیت ضرور ہیں لیکن یہ ایمان اور اسلام کی دلیل نہیں ہیں۔ اور نہ ابتدائے اقدام میں ان پر اصرار تقویٰ کا مظہر ہے۔ کھانے پینے اور غذا میں اسلام کی شرط صرف پاکی اور حلال کا لحاظ ہے۔ جس کسی نے زندگی بھر گوشت نہ کھایا ہو، اس کو روزِ اول سے گوشت خور (Non-Veg) بنانا کلچرل تقاضا تو ہوسکتا ہے، مگر دین حق کا تقاضا ہرگز نہیں ہے۔ مغرب میں اس طرح کے متعدد واقعات درپیش آتے ہیں۔ ہندستان میں بھی پیش آسکتے ہیں۔ خواتین کے لباس کا مسئلہ اور بھی نازک ہے، غرارہ اور شلوار مسلمان خواتین کے بعض طبقات میں اگر رائج ہیں تو ان کی جگہ پر دھوتی کو چھوڑنے پر اصرار، اسکرٹ اور جینز چھوڑنے پر دین وایمان کا اولین تقاضا بنا کر پیش کرنا دینی تعلیمات کی صحیح روح کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔

پردہ

اس سلسلے میں ضروری ہے کہ ہم دینی ترجیحات کو سامنے رکھیں۔ تہذیبی پسند اور ناپسند نافذ کرنے سے احتراز کریں۔ حجاب خواتین، شعار اسلامی ضرور ہے، لیکن پہلے ہی قدم پر نومسلم خواتین کو اس پر مجبور کرنا داعیانہ حکمت عملی نہیں ہے۔ زن وشو کے تعلقات کے بارے میں ''اسلامک کونسل آف یورپ'' نے جو فتویٰ دیا ہے، وہ اس حکمت کی طرف ایک پیش رفت ہے۔ اس کی رو سے نومسلم شوہر اپنی غیر مسلم بیوی سے جنسی تعلق رکھ سکتا ہے اگرچہ اس فتویٰ میں یہ حکمت عملی پیش نظر رہی ہے کہ اس طرح مستقبل میں غیر مسلم بیوی کے اسلام لانے کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس میں بعض پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ مسئلہ اس فتوے کی حقانیت کا نہیں ہے، بلکہ اس امر کا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں تدریج پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

دو اہم عناصر

نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدریج کی نہایت حکیمانہ تعلیم دی گئی تھی۔ اس تدریج کی وجہ یہ تھی کہ نومسلم رفتہ رفتہ پورے اسلام پر عمل کرنے کے قابل بن جائیں۔ شراب کی حرمت کی تدریج اس کی بین مثال ہے۔ دور حاضر میں بھی اس تدریج کو اختیار کرنا حکمت کی دلیل ہے۔ یہ بات مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس تدریج کا تعلق عملی زندگی سے ہے، اسلام کے بنیادی عقائد سے نہیں۔ عقیدہ توحید اپنی کامل شکل میں روز اول سے اختیار کرنا لازم ہے، اسی طرح عقیدہ رسالت اپنی پوری شان سے نومسلم کے ایمان کا جز روز اول سے بننا چاہیے۔ اسی طرح آخرت پر یقین وایمان کو بے کم وکاست اختیار کرنا لازمہ ایمان ہے۔ لیکن عملی دنیا میں تدریج ہی ملحوظ رکھنے سے اس امر کا قوی امکان ہے کہ ان اقدار کی طرف پوری دل جمعی اور رضائے قلب سے وابستگی پیدا ہو۔

ایک عام انسانی معاشرے سے متعلق داعی حق کا یہ رویہ دو اہم عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اس امر پر یقین رکھتا ہے کہ خیر کے رجحانات کم وبیش ہر گروہ انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ عام انسانی اخلاقیات سے متصف ہوئے بغیر کوئی بھی سماج قائم نہیں رہ سکتا۔ نیکی، رحم دلی، انصاف اور بھائی چارہ کے مختلف مراتب کسی خاص گروہ کا ٹھیکہ (Monopoly) نہیں ہیں۔ قتل وغارت گری سے احتراز، چوری، ڈکیتی سے اجتناب ہر خیر پسند انسان کی زندگی کا شعار ہیں۔ مثلاً ہندستانی سماج میں برادران وطن میں خیر پسند اور خیر پر عامل انسانوں کی کمی نہیں ہے۔ یہی وہ جوہر انسانیت ہے، جس کی طرف پیغمبرانہ حکمت نے واضح اشارہ فرمایا ہے:

خِیَارُکُمْ فی الجاهلیةِ خِیارُکم فی الإسلام۔

"تم میں سے جو لوگ دور جاہلیت میں بہتر تھے، وہ قبول اسلام کے بعد (اسلامی معاشرہ میں) بھی بہتر ہیں۔"

اور یہی وہ حقیقت ہے، جس کی طرف واضح نشان دہی قرآن کریم نے فرمائی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں کے بارے میں ارشاد ہے:

وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً (الحدید:۲۷)

جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیے ہیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡھُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُھۡبَانًا وَّ اَنَّھُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ٥ (المائدہ:۸۲)

''یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں (نصاریٰ میں) عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔''

خیر پسندی کا عمومی وجود امیدوں کا سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خیر پسندی حیات انسانی کا خاصہ بنایا ہے۔ اس خیر پسندی کے نتیجے میں انسانوں کو توفیق ہدایت ملتی ہے۔ قرآن کی زبان میں ہدایت ان کو ملتی ہے، جو خیر و فلاح کے طالب ہوتے ہیں۔ جویائے حق ہی منزل تک پہنچتا ہے۔

داعیانہ رویہ کی دوسری بنیاد عام انسانوں سے محبت ہے۔ انھیں یہ تلقین کی گئی ہے کہ مخاطب دعوت کے سامنے ناصح امین کی حیثیت سے پیش ہوں۔ داعی کے طرز عمل سے یہ ثابت ہو کہ وہ کسی اجر کا طالب نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں کو ابدی خسران سے بچانے کی فکر اس کو بے چین رکھتی ہے۔ اس کے شب و روز اس فکر میں گزرتے ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے غضب کا شکار نہ ہوں۔ اس مخلصانہ جدوجہد کے درمیان انبیاء علیہم السلام کو طرح طرح کی اذیت دی گئی۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا کہ وہ اقتدار کا طالب ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیا پر ساحر اور مجنون کی پھبتی کسی گئی لیکن آپ نے اس کی پروا نہیں کی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو تنبیہ کرنا پڑی:

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِھٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا٥ (الکہف:۶)

''(اچھا تو اے نبی) تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر وہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔''

داعی ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، غریبوں اور کمزوروں کا ہمدرد اور دادرس ہوتا ہے۔ غریبوں اور فقرا کی اشک شوئی کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہتا ہے۔ عزت و آبرو کا محافظ ہوتا

ہے، انسانی جان کو محترم سمجھتا ہے۔ یہ سب اس کے داعیانہ کردار کے اخلاص کی قطعی علامتیں ہیں اور انھیں سے اس کی دعوت کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔

کلمہ حق کی دعوت کسی مسلک اور مذہب کی طرف نہیں ہے۔ بد قسمتی سے ملت اسلامیہ نے مسلکوں اور مذاہب پر عمل کو حقیقت دین پر ترجیح دے دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نومسلم دین حق کو اختیار کرنے کے بعد ایسے جنگل میں گم ہو جاتا ہے، جس سے نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ دنیا میں پائے جانے والے دوسرے مذاہب کے، جو خود ساختہ جال ہیں، ان سے دور حاضر کا نوجوان پریشان ہے، اس سے پریشان ہو کر جب وہ توحید کے صاف، شفاف چشمے کی طرف بڑی امیدوں سے رجوع کرتا ہے کہ اب بندے اور خدا کے درمیان سیدھا اور صاف راستہ مل جائے گا، جس پر نہ فلسفیانہ جھاڑیاں ہیں اور نہ پنڈتوں، پروہتوں اور چرچوں کی کھڑی کی ہوئی دیواریں ہیں۔ بلکہ بندہ اور خدا کے درمیان بہ راہ راست پہنچنے کا امکان ہے۔ وہ جب داخل اسلام ہوتا ہے تو اسے بہت سی لاینحل گتھیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شیعہ بنے کہ سنی، بریلوی مسلک اختیار کرے یا دیو بندی، پیری مریدی کی راہ پر چلے یا آزاد راہ اختیار کرے؟ اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہر مسلک، نجات اخروی کو اپنی پیروی سے وابستہ قرار دیتا ہے۔ بعض ستم ظریف اپنی دینی جدوجہد کو نوح علیہ السلام کی کشتی قرار دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے دین کے ساتھ ایسا ظلم ہے، جو بہ زعم خود شعار تقویٰ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اسلام کی دعوت صرف توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت ہے۔ اس دین نے ہر شخص کو قرآن حکیم پر بہ ذات خود تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، وہ فرد انسان کا رشتہ بہ راہ راست اپنے خالق و مالک سے قائم کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ:

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ۝ (قٓ:١٦) ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اور یہ بشارت دیتا ہے کہ:

وَ قَالَ رَبُّکُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ؕ (المومن:٦٠)

''تمھارا رب کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری پکار سنوں گا۔''

یہ محض خیالی باتیں نہیں ہیں بلکہ عملی حقائق ہیں، جن کا سامنا داعیان حق کو مغربی دنیا میں کرنا پڑ رہا ہے۔ امریکہ میں ایسے افسوس ناک واقعات پیش آرہے ہیں کہ ایک مخلص نوجوان

اسلام لانے کے بعد شیعہ اور سنی کے چکر میں پھنس گیا اور رفتہ رفتہ وہ لذت ایمان سے محروم ہو گیا۔ کتنے ایسے ہیں، جو بریلوی اور دیوبندی کے اختلافات میں گرفتار ہو گئے۔ یہاں تک کہ مغرب میں بھی بریلوی اور دیوبندی مساجد بن گئیں۔ ہندستان، پاکستان اور دوسرے مشرقی مسلم سماج کی بیماریاں ہمارے علما اور جہلا دونوں ساتھ لے کر امریکہ، انگلستان اور کناڈا میں پہنچ گئے اور یہ بھول گئے کہ عصر حاضر میں داؤ پر مسالک نہیں، نفس اسلام ہے اور دعوت حق کی حقیقی طاقت اس کا کلمہ توحید ہے نہ کہ مسلکی ادعا۔ سیرت نبویؐ کا بیش بہا خزانہ ضائع کر کے ہم مسلکی علماء کی عظمت کا گن گانے لگے۔ بہ قول مخلص و نو مسلم مفکر مراد ہاف مین کے: یہ چیزیں دور حاضر میں اسلام کی اشاعت میں خود ساختہ رکاوٹیں بن گئی ہیں۔

دعوتِ حق کا مستقبل

اس دعوت کا مستقبل مثبت جدوجہد سے وابستہ ہے، الزام اور پھبتی کے خلاف جواب دہی بے کار ہے اور یہ محدود تاثیر ہی پیدا کر سکتی ہے۔ ۱۱ر ستمبر کے بعد جواب دہی پر مشتمل لٹریچر کی بھرمار ہے۔ مثلاً اسلام دہشت گردی نہیں سکھاتا، یہ عورتوں کو قید و بند میں مبتلا نہیں کرتا، جہاد کا مقصد غیر مسلم کے خلاف دائمی یورش نہیں ہے، ہم طالبان کے خلاف ہیں اور جمہوریت اسلام کا جوہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ تصانیف اور تقاریر معذرت خواہی (Apologia) کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس لیے اس ضیاع قوت سے بچ کر ملت اسلامیہ کو غلط فہمی اور غلط اندیشی کے ان بنیادی اور اساسی پہلوؤں پر توجہ کرنا چاہیے، جن کی لہلہاتی کھیتی نے خاموشی سے اس سیاسی پروپیگنڈہ کو پروان چڑھایا ہے۔ عام انسانوں کے دل و دماغ کو متاثر کیا ہے، چھوٹے چھوٹے پودے اور خس و خاشاک ہیں، جنھوں نے مل جل کر بہ ظاہر نا قابل عبور جنگل پیدا کر دیے۔ مثلاً نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے، اذان کے الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ روزہ کس نوعیت کی عبادت ہے، قربانی کس شعار کا احیاء ہے، مدرسے کے اسباق کن مضامین پر مشتمل ہیں، عربی زبان سے ہماری محبت کس جذبہ ایمان کا نتیجہ ہے، اذان، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ مل کر کس طرح کے انسان بناتے ہیں۔ دعوتِ اثبات اسی نہج پر دی جاتی ہے۔ اس نہج کو چھوڑ کر اگر ہم کوئی اور نہج اختیار کرتے ہیں تو وہ یا تو منفی ہوگا یا معذرت خواہی کا اظہار۔ تعارف کی مہم صرف زبان و قلم سے نہیں چلائی جاتی بلکہ اس

کے ساتھ داعی ملت کا عملی کردار بھی اس کا لازمہ ہے۔میڈیا کی زہر آلود مہم کے موثر سدباب کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ہمارا اپنا طاقت ور میڈیا ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ میڈیا کے غیر مسلم ذمہ داروں سے قریبی ربط قائم کیا جائے اور ان کو بہ راہ راست ان جیسے امور سے واقف کرایا جائے۔ ہندستان کی عام غیر مسلم برادری سے عام تجارتی، سماجی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے پر ہندستان کا مسلمان کس حد تک مجبور ہے، لیکن افسوس ہے کہ داعیانہ تعلق قائم کرنے کی نہ اس کو فکر ہے اور نہ سلیقہ۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں بیت گئیں مگر غیر مسلم برادران وطن مذکورہ بالا امور سے ناواقف ہیں۔ فطرت خلا برداشت نہیں کرتی، اس لیے اگر مثبت خیالات موجود نہ ہوں گے تو شر پسندی ان کی جگہ لے گی۔ یہی کچھ اس وقت ہندستان میں ہو رہا ہے اور غیر مسلم دنیا کا بڑا حصہ اسی سے مغلوب اور متاثر ہے۔قرآن کریم کی بشارت ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّاo (مریم:۹۶)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کر رہے ہیں، عن قریب رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کردے گا۔''

اس انقلاب احوال پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ قادر ہے۔ وہ دلوں کو مسخر بھی کرتا ہے۔اس نے ہمیشہ داعیان حق کو اس حیرت انگیز انقلاب کی خوش خبری دی ہے، جس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بھی سکھائی ہے جو کلمۂ حق کی پشتیبان ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌo (حٰمٓ السجدہ:۳۴)

''(اے نبیؐ) تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو، جو بہترین ہو۔تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔''

دعوتِ اسلامی اور ہمارا طرزِ عمل

دعوت حق کے طویل سفر کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی پیش آتا ہے جب مخاطب بستیوں اور افراد کی طرف سے مایوسی طاری ہونے لگتی ہے۔ شائقین دعوت یہ سوچنے لگتے ہیں کہ زمین بڑی سنگلاخ ہے اور حالات نہایت صبر آزما ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دعوت حق کی کھیتی کیسے پروان چڑھے گی۔ مایوسی اور بے زاری کے ان جذبات کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان میں کچھ کا تعلق خارج سے ہو سکتا ہے اور کچھ کا سلسلہ دراز ہو کر داخل کی کیفیات تک پہنچتا ہے۔ ان دونوں قسم کے اسباب کا ادراک اور ان کا تجزیہ ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تحفظ دعوت اور توسیع دعوت کے بہ ظاہر متضاد تقاضوں کے درمیان ہم اس ضرورت سے یکسر غافل نہیں رہے ہیں۔ گرچہ خارجی حالات پر ہماری توجہ زیادہ مرکوز رہی ہے، لیکن تحریک اسلامی کے بیدار مغز قائدین نے خود احتسابی کا دروازہ بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔

دعوت اور تربیت کا ایک فطری اور تدریجی طریق کار ہے، جو ہم کو قرآن کریم اور سنت رسولؐ سے ملتا ہے۔ بسا اوقات جوش دعوت میں ہم اس کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں۔ جب اس جوش دعوت کو وہ مقبولیت نہیں ملتی، جس کی داعی تمنا کرتا ہے تو اس پر تھکن اور مایوسی کے جذبات طاری ہونے لگتے ہیں اور وہ اس کم یابی کے اسباب، خارجی حالات میں تلاش کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ خود پر نظر ڈالنے سے کتراتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حالات زمانہ کی سنگینی اور مخاطب کی بد بختی اور کم نظری کو مجرم گردانتا ہے۔ مایوسی کے ان لمحات میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ تغیر احوال کا وہ مکلّف نہیں ہے بلکہ اس کی ذمے داری صرف اتنی ہے کہ وہ باحسن

وجوہ اور پورے انہماک سے اس تغیر کے لیے سرگرم عمل رہے اور اپنے کردار کو قبول دعوت میں حائل نہ ہونے دے۔ نتائج کو مُصرّفُ القلوب کے حوالے کردے، جو کچھ اس کے بس میں ہو، اسے کرے۔

دعوت و تربیت کا اولین میدان کار داعی کی اپنی شخصیت اور ذاتی کردار ہوتا ہے۔ وہ مخاطب تو تمام انسانوں کو کرتا ہے۔ اس لیے کہ بندگیٔ رب کا پیغام تمام انسانوں کے لیے نفع بخش ہے۔ لیکن اس کو سب سے پہلے اپنی فکر ہوتی ہے کیوں کہ اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے۔ انسان کا نفس مسلسل اس پر آمادہ کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں کو یا تو نظر انداز کردے یا ان پر خوش نما دلیلوں اور بہانوں کے پردے ڈال دے۔ ہمارے اندر ایسے فریب زدہ لوگ پائے جاتے ہیں، جو حوصلے کی کمی اور جدوجہد کی سردی کے لیے دوسروں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تو بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے ساتھی کوتاہ عمل ہیں، بے بصیرت ہیں اور دنیوی مشغلوں میں غرق ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا ہے کہ عزیمت اور ایثار پسندی اوپر سے آتی ہے، لیکن اب ایسے رہنما کہاں رہ گئے؟ اب جو لوگ ہمارے قائدین بنے بیٹھے ہیں ان میں وہ خوئے دل نوازی کہاں، جو خرمن دل میں آگ لگا دیتی ہے! کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فرائض اور ذمے داریوں سے غفلت ہمارے رفقائے سفر کا شعار بن گئی ہے۔ یہ وہ چند بہانے ہیں، جن کو پیش کرتے وقت بعض تحریکی ساتھی پوری چرب زبانی سے کام لیتے ہیں۔ انفرادی گفتگوؤں میں مجلسوں میں اس طرح کے عذرات تراش کر یہ لوگ بزعم خود اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طلاقتِ لسانی سے متاثر ہو کر آپ ان افراد کی تلاش شروع کردیں، جن پر یہ الزامات صادق آسکتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کہنے والے خود ہی ان میں مبتلا ہیں۔ اسلام اصلاً دین عزیمت ہے۔ وہ کم زوروں کے لیے بھی پناہ گاہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن رفعت مراتب ان کا مقدر ہوتی ہے، جو عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی اور دعوتِ حق تو بدرجہ اولیٰ عزیمت کی راہ ہے، وہ دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے کا حوصلہ سکھاتی ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی تھی کہ وہ اس تحریک کا دامن تھام لے، اس نے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ راہِ عزیمت اختیار کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام تمام کے تمام داعیانِ حق تھے۔ اس لیے ان کی شان، شانِ عزیمت تھی قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔ رسول آخر ﷺ کا اسوۂ حسنہ

اس کی روشن دلیل ہے، قرآن کریم میں حکم ہے:

وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ○ (الزمر:۱۲)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلم بنوں۔''

رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد یہ اعلان عزیمت کیا گیا:

قُلْ: اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ (الانعام:۱۶۳)

''آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

عزیمت کے اس مقام کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب بندے کو بار بار صبر کی تلقین کی اور یہ تسلی دلائی کہ ہم وہ سب کچھ دیکھ سن رہے ہیں، جو دشمن تمھیں کہتے ہیں اور جس ظلم وستم کے تم شکار ہو، وہ ہماری نظر میں ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور:۴۸)

''اور آپ اپنے رب کے اس حکم پر صبر کیجیے اس لیے کہ آپ ہماری نگاہ میں ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کو جس مقامِ عزیمت پر خداوند کریم رکھنا چاہتا تھا اس کا اندازہ اس ارشاد سے بہ خوبی ہوسکتا ہے:

وَ لَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا○ (بنی اسرائیل:۷۴،۷۵)

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدمی نہ بخشی ہوتی تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھک جاتے۔ (اگر ایسا ہوتا) تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور موت کے بعد دوہرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔''

آپ کی شان عزیمت میں اللہ رب العزت کو ذرہ برابر بھی نقص گوارا نہ تھا کہ آپ جائز بشری جذبات کے تحت ایک حلال وطیب غذا سے مکمل احتراز فرمائیں، جیسا کہ سورہ تحریم کی ابتدائی آیات بتاتی ہیں یا خالص دعوتی جذبات کی رو میں ایک نابینا صحابی کی ضرورت تزکیہ سے وقتی طور پر صرف نظر کرلیں۔ آپؐ نے انسانوں کو یہ سبق سکھایا کہ دنیا کے سامان راحت اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مظہر ہیں اور ان کا صحیح اور جائز استعمال اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری سے عبارت ہے، لیکن آپؐ کی شان عزیمت یہ تھی کہ کھجور کی چٹائی پر آرام کرتے تھے، روکھی پھیکی غذا پر اکتفا کرتے اور موٹے اور کھردرے لباس زیب تن فرماتے تھے۔ ایک زمانہ وہ آیا جب کہ آپ کے اشارہ چشم و ابرو پر دنیا کی نعمتیں حاضر ہوسکتی تھیں مگر آپؐ نے دُرویشی اور سادگی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ پھر ایک دور آپؐ پر ایسا بھی آیا تھا جب کہ مکہ اور طائف کی جاں گداز پریشانیاں آپؐ پر گزر رہی تھیں۔ اس کے متعلق یہ حدیث سنیے:

عن ابی هریرة قال ان کان یمر بآل رسول الله الاهلة ما یسرج فی بیت احد منهم سراج ولا یوقد فیه نار. ان وجدوا زیتا ادهنوا به. (ترغیب وترہیب، جلد: ۴)

’’حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے گھر والوں پر کئی مہینے اس حال میں گزر جاتے کہ ان میں کسی کے یہاں چراغ نہ جلتا اور نہ آگ جلانے کی نوبت آتی۔ اگر زیتون کا تیل مل جاتا تو سر میں لگالیتے۔‘‘

دوسری حدیث اس زمانے کے متعلق سنیے جب کہ آپ ﷺ کو اقتدار حاصل ہوچکا تھا:

عن ابی مسعودؓ: نام رسول الله ﷺ علی حصیر فقام و قد اثّر فی جنبه فقلنا یا رسول الله! لو اتخذنا لک وطأ فقال: مالی و للدنیا؟ ما انا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرة ثم راح و ترکها. (ترمذی)

’’حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر سوئے۔ جب آپؐ اٹھے تو چٹائی کے نشانات آپؐ کے پہلو میں ہم نے دیکھے، تو ہم نے کہا:

اے اللہ کے رسولؐ! اگر ہم آپؐ کے لیے کوئی گدا بنا دیں تو کیسا رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے دنیا سے کیا مطلب؟ میں تو دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں، جس نے کسی درخت کے سائے میں کچھ دیر آرام کیا، پھر درخت اور درخت کے سائے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگیا۔''

یہ اس نبی محترمؐ کا شعار تھا، جس کی زبان سے قرآن نے یہ اعلان کیا تھا کہ رہبانیت انسان کی خود ساختہ بدعت ہے اور طیبات رزق، اللہ تعالیٰ کی عنایات ہیں، جن سے بچنے کا مالک کائنات نے کبھی حکم نہیں دیا ہے۔ عزیمت کی اس رفعت پر پہنچنا کم زور انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے، ہم کو تو یہ حکم دیا گیا ہے:

إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا. (الحدیث)

''تم پر تمھاری جانوں کا حق ہے اور تمھارے گھر والوں کا حق ہے۔''

اور قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:۷۷)

''جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔''

اسلامی تعلیمات کی شانِ امتیازی

اسلامی تعلیمات کی شانِ امتیاز یہی ہے کہ اس نے حسن استعمال سکھایا ہے، ترک دنیا نہیں۔ لیکن تحریک اسلامی سے ہماری وابستگی اس عزم کا شعوری اظہار تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی دکھائی ہوئی راہِ عزیمت پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ زندگی کی متاع کو اس پر لگائیں گے، جو وقت اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اسے اس کی راہ میں صرف کریں گے، جو وسائل اس نے عنایت کیے ہیں، وہ اس کے دین پر حتی المقدور لٹائیں گے۔ اگر فقیر اور قلندر نہ بن سکے تو اس طرح کا ذہن و مزاج بنائیں گے، جو ''تکاثر'' نہ کہلائے۔ ہم ''دین وسط'' کی تعلیمات کا مجمل شعور رکھتے تھے۔

اس لیے دنیا کو لات مارنے کی غیر اسلامی روش ہم نے کبھی اختیار نہ کی تھی۔ بلکہ دنیا طلبی۔ سے بچنے کا عزم ہمارا زادِ راہ تھا۔ اب ہمارا حال کیا ہے؟ ہم عزیمت کے بجائے رخصت کے متلاشی ہیں۔ ہم نے تحفظات کی دنیا بنالی ہے۔ دوسروں کو الزام دیتے دیتے ہم خود غرق ہوتے جارہے ہیں۔ آج کی دنیا میں روزی کے حلال اور پاکیزہ ذرائع کم یاب ہیں۔ اس لیے ہم بھی فقہی اور قانونی موشگافیوں کا سہارا لینے لگے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ملت میں ایسے فقیہوں کی کمی نہیں ہے، جو حدود اللہ کے آخری سرے پر پہنچانے میں ماہر ہیں۔ ہم میں کتنے ایسے ہیں، جو احوال وظروف کی تنگ ظرفی کا سہارا لے کر رفتہ رفتہ اوروں کے رنگ میں رنگتے جارہے ہیں۔

اپنے نصب العین سے عشق ومحبت، بڑی جدوجہد سے نصیب ہوتی ہے، لیکن سہل انگاری اور رخصت پذیری متعدی امراض ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی کرتے کرتے ہم میں بھی وہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ گندگیاں اچھالنے والا کبھی آلودگی سے نہیں بچ سکتا۔ اپنے رفقائے کار کی سستی تلاش کرتے کرتے ہم میں یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ جب سب راہِ عزیمت سے فرار اختیار کر چکے ہیں تو ہم کو کیا پڑی ہے کہ ہم تن تنہا محاذ پر ڈٹے رہیں۔ مگر رخصتوں پر عامل کردار دفعتاً پیدا نہیں ہوتا۔ نہ بے وجہ پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بعضوں کی زندگی میں فرائض عبودیت سے غفلت، دعوتی جدوجہد میں مصروفیت کے بہانے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنی سرگرمیوں کے دوران نماز باجماعت کا وقت نہیں نکال پاتے۔ کچھ اسلام کی علمی اور تحقیقی خدمات میں انہماک کے سبب اس میں کوتاہی برتتے ہیں، کچھ مہتم بالشان اسلامی کانفرنسوں میں ہم نے یہی دیکھا ہے۔ کچھ لوگ بزعم خود، دین حق کی ترجیحات بدلنے لگتے ہیں۔ بعض قابل قدر نوجوان عزیمت اور جہاد کا سبق دیتے دیتے پہلے سنن اور نوافل کی اہمیت کم کرتے ہیں، پھر فرض نمازوں کی ادائی سے غفلت برتنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ شروع اس طرح کرتے ہیں کہ ’’تراویح غیر ضروری ہے‘‘، پھر رمضان المبارک کے مقدس ایام میں بھی جماعت کا اہتمام کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں اور رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد بھول جاتے ہیں:

الصلوة عماد الدين فمن أقامها أقام الدين و من هدمها هدم الدين. (الحديث)

''یعنی نماز دین کا ستون ہے تو جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اس کو گرادیا اس نے دین کو گرادیا۔''

فرائض عبودیت بالخصوص نماز با جماعت کے اہتمام سے غفلت، اجتماعیت سے غفلت کا راستہ آسان کردیتی ہے، اسی طرح نفلی عبادتوں کو غلط تصوف کہہ کر ڈسمس کرنا، ایک مہلک رجحان ہے۔ ابتداءً بعض سرگرم عمل ساتھیوں کے اندر یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے سست کار ہیں تو ہم کیوں سرگرم کار رہیں؟ بسا اوقات یہ محض بدگمانی پر مبنی ہوتا ہے۔ الحمدللہ، تحریک اسلامی میں ایسے لوگوں کا فقدان نہیں ہے، جو عمر کے آخری مرحلے تک بھی سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ڈھلتی عمر، قویٰ کو مضمحل کردیتی ہے، اس لیے اگر بوڑھے آگے نہیں بڑھتے تو ان کا بہانہ بنانا نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ پھر تحریکی سرگرمیوں کے متعدد میدان کار ہیں۔ ہر کام ہر شخص نہیں کرسکتا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں اور اپنے رجحان کے مطابق میدان کار منتخب کرنا چاہیے اور ان لوگوں کی ظاہری سستی کو اپنے لیے بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ تردد بڑھتے بڑھتے جماعتی ذمے داریوں سے فرار میں تبدیل ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ معمول کے اجتماعات سے غیر حاضری بھی ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ ذاتی مصروفیات تحریکی ذمے داریوں پر ترجیح پانے لگتی ہیں۔ ایک اور راہ سے بھی یہ کم زوری در انداز ہوتی ہے۔ بعض لوگ تحریک کی رفتار کار اور اس کے طریق کار سے پہلے غیر مطمئن ہوتے ہیں تو رخصت کو شیوۂ زندگی بنالیتے ہیں اور وہی سب کچھ اپنی زندگی میں گوارا کرلیتے ہیں، جس پر وہ مضطرب تھے۔ ہمارے بعض رفقاء اپنے پہلے دور میں سرگرمی عمل اور انفاق مال کے لحاظ سے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی ذاتی پسند کے مطابق کام نہیں ہورہا ہے۔ ساتھ ہی ان کے رفقائے کار کی بعض کوتاہیوں کا انھیں علم ہوگیا تو انھوں نے پہلے انفاق سے دست کشی اختیار کی، پھر خاموشی سے اصلاح حال کے بجائے برملا بے زاری کا اظہار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ہم نشیں اور ان کے اہل خاندان، سب ہی تحریک سے بے زار ہوگئے اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ عزیمت پر قائم ہیں۔ یہ بھی عجیب رخصت ہے، جس کو آپ بزعم خود ''عزیمت'' کا نام دیتے ہیں۔

عزیمت اس امر کا نام ہے کہ جس نصب العین اور جس طرح طریق کار کے لیے آپ نے اجتماعی زندگی اختیار کی ہے، اس پر ثبات قدمی اور ذہنی یک سوئی سے قائم رہیں۔ اگر

تفصیلات پر آپ کو اطمینان نہیں ہے تو یہ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ دوسرے لوگ بھی عقل اور استدلال سے بہرہ ور ہیں اور وہ بھی تحریک کے مخلص خادم ہیں۔ اختلافات تو فطری ہیں۔ جب اجتماعیت فیصلہ کر لے تو یہ سمجھنا چاہیے اور دعا بھی کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

(آل عمران:۱۵۹)

''اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔ جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اسے زیرِ عمل لاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو۔''

'' كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ '' کا رجحان اجتماعیت کے لیے سم قاتل ہے۔ ایک عظیم فقیہ نے بہترین رویے کی کیا خوب نشان دہی کی ہے:

رائی صواب یحتمل الخطأ و رأیک خطأ یحتمل الصواب.

''یعنی میری رائے صحیح ہے، جس میں خطا کا امکان ہے اور تمھاری رائے غلط ہے، جس میں صحیح ہونے کا امکان ہے۔''

اسی طرح ہمارے بعض سمجھ دار اور سرگرم عمل ساتھیوں کا طرزِ عمل اجتماعیت کے خلاف ہے، وہ کچھ دور تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ دور دوسروں کا۔ انھیں اس نصب العین میں بھی کشش نظر آتی ہے اور دوسروں کے وقتی مقاصد میں بھی۔ وہ اگر اجتماعی فیصلوں کی بعض شقوں سے اختلاف کرتے ہیں تو صرف ان سے برملا اعلان برأت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نیت پر بھی نبہ کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل یا تو خود رائی کا نتیجہ ہوتا ہے یا نصب العین کے متعلق تذبذب اور تردد کا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ہر محفل کی رونق بننا وہی چیز ہے، جس کو ملت اسلامیہ اور ملک کے عمومی مفادات کے لیے دوسرے گروہوں کی تائید کرنا اور حسب مقدور ان سے تعاون کرنا کہا جاتا ہے، جو کہ تحریک کے پروگرام میں داخل ہے۔ مؤخر الذکر امر اجتماعی فیصلہ چاہتا ہے۔ کہاں کہاں دست تعاون بڑھانا چاہیے اور کس حد تک دوسروں کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ ہر فرد و بشر کی ذاتی پسند پر منحصر نہیں ہوتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو انتشار فکر جنم لے گا اور اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ عزیمت

استقامت چاہتی ہے، سرگردانی نہیں۔ مذکورہ رویہ تو رخصتوں کی آماجگاہ ہے۔ اپنے نصب العین سے تذبذب، کردار میں ایک ایسی کم زوری پیدا کرسکتا ہے، جس سے فرد کو طلاقت لسانی سے بہکایا بھی جاسکتا ہے اور عز وجاہ کی لالچ کا شکار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صحت منداور تعمیری اختلافات تحریکی پیش رفت کے ضامن ہیں۔ وہ کسی فکری یک رخی (Regimentaion) کو صحیح نہیں سمجھتی، جس میں طریق کاراور ترجیحات عمل میں اختلاف گوارا نہ کیا جاتا ہو۔ اس طرح کے اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی رائے کے مطابق کوئی بھی فرد، جس راستے پر چاہے چلے اور جن ترجیحات کو بزعم خود وہ صحیح سمجھتا ہو، ان کے مطابق اپنی سرگرمیاں ترتیب دے۔ تحریکی فیصلوں کو ہم نے کبھی بھی حق و باطل کا معیار نہیں سمجھا ہے اور نہ بعض خود فریبی میں مبتلا گروہوں کی طرح تحریک اسلامی کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی قرار دیا ہے، جس کے باہر باطل ہی باطل ہے، البتہ ہم نے دو باتیں قرآن وسنت سے اخذ کی ہیں۔ پہلی بات، ہمارا نصب العین ہے، جو درحقیقت تمام ملت کا نصب العین ہے اور ہونا چاہیے۔ دوسری یہ کہ اس نصب العین کے لیے اجتماعیت شرط لازم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو بھی قرآن وسنت سے اخذ کیا ہے۔ اب جس شخص کو ان بنیادوں پر اطمینان نہیں ہے اس کو فکر ونظر کے تردد میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی پسندیدہ راہ اختیار کرنا چاہیے۔

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک اسلامی عزم وحوصلے کی داستان لکھنے کی ایک حقیر، لیکن مبارک کوشش ہے۔ اس کو کم حوصلہ، پست ہمت، رخصتوں میں مبتلا، تزکیہ نفس سے غافل گروہ کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کو ایسے لوگوں کی بھی ضرورت نہیں ہے، جن کی روش یہ ہو کہ ؂

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ بر کے ساتھ

اس تحریک کی اساس "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" پر رکھی گئی ہے، شتر گربگی اس کی عین ضد ہے۔ استقامت اور عزیمت کی یہ شان ہمارے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر مرحلے میں جھلکتی ہے۔ اس رفعت مقام پر پہنچنے کے لیے آپ کو رات کی نیندیں حرام کرنی پڑیں۔ فرض نمازوں کے ساتھ آپ کو تلقین کی گئی:

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل:۲۹)

''اور رات کے حصے میں تہجد پڑھا کیجیے، جو آپ کے لیے زائد (عبادت) ہے۔ توقع ہے آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر پہنچائے گا۔''

آپ کو بتایا گیا کہ آپ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر صرف کریں۔ اس لیے کہ آپ کا رب آپ پر گراں بار ذمے داری ڈالنے والا ہے (المزمل)۔ چناں چہ آپ نماز میں اتنا طویل قیام کرتے کہ آپ کے قدم ہائے مبارک میں سوجن آ جاتی اور جب آپ سے یہ کہا گیا کہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیے گئے آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں تو آپؐ نے جواب دیا: اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا ''کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔'' (بخاری عن المغیرہ بن شعبہ)

دعوتِ اسلامی اور اسوۂ انبیاء

دعوتی جدوجہد کی طویل داستان عزیمت کے لیے آپؐ کی سیرت کا وہ رخ دیکھیے کہ آپؐ کو مشفقانہ ڈانٹ سننی پڑی کہ کیا آپ اس دعوت کے لیے اپنی جان ہی ہلکان کر ڈالیں گے۔'' (الشعراء:۳) عزیمت کی شان اس روایت سے بھی جھلکتی ہے، جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نبی ﷺ ایک نبی کا حال بیان کر رہے تھے۔ وہ منظر میرے سامنے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: (دعوت الی اللہ کے جرم میں) قوم نے نبی کو اس قدر مارا کہ اس کا جسم خون سے لت پت ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے کہا: ''اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے، وہ نہیں جانتی۔'' (بخاری، کتاب الدنیا)

حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہی اسوہ رہا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے نفس پر توجہ کی کہ ان کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ فکر و عمل کی دورنگی سے ان کو دور کا واسطہ نہ تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس کا اعلان بھی کیا اور اس طرز عمل کو اپنی زندگی کا شعار بھی بنا لیا۔ وہ قول و عمل کی ہم آہنگی میں اتنے محکم تھے کہ اس کو اپنی دعوت کی صداقت کے لیے دلیل محکم کے طور پر پیش کرتے تھے:

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ھود:۸۸)

''اور میں نہیں چاہتا کہ تمھارے پیچھے ان کاموں کو کروں، جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔''

اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کا ارشاد گرامی بھی اسی کا مظہر ہے۔

اپنے نفس کے بعد دعوت و تربیت کے دوسرے مخاطب انسان کے اپنے قریب ترین اعزہ ہیں۔ سب سے پہلے اپنی اولاد ہے، اپنی بیوی ہے، اپنے اہل خاندان ہیں۔

قرآن کریم میں اس فطری ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

''اے ایمان لانے والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو (جہنم کی) آگ سے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں اس فطری تدریج کی مظہر ہیں:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَؕ (ابراہیم:۳۵)

''اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے رب! اس شہر کو امن والا بنا دیجیے اور مجھ کو اور میرے فرزندوں کو بتوں کی پرستش سے بچائیے۔''

دوسری جگہ آپ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ (ابراہیم:۴۰)

''پروردگار! مجھے اور میری ذریت کو نماز قائم کرنے والا بنا دیجیے۔ اے ہمارے رب! ہماری یہ دعا قبول کیجیے۔''

سورۃ الفرقان میں عباد الرحمٰن کی صفات بتاتے ہوئے ان کی یہ دعا نقل کی گئی ہے:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (الفرقان:۷۴)

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائیے اور ہمیں متقیوں کا امام بنائیے۔''

اس دعا میں اولاد کے ساتھ بیوی کا بھی واضح ذکر ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد ان کی پاکیزگی اور تقویٰ شعاری ہے، جس سے بندہ مومن کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے اور دل کو سکینت۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کو وہ خود پسند کرتا ہے اس سے اپنے محبوب اہل و عیال کو بھی مستفید کرنا چاہتا ہے۔ جس فکر ونظر کو وہ صحیح سمجھتا ہے، اس کو اپنے اعزہ و اقربا تک نہ صرف پہنچانا چاہتا ہے بلکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کو اپنالیں اور جس سے وہ خوف کھاتا ہے اس سے ان کو بچانا چاہتا ہے۔ پروردگار کی رضا سے زیادہ پسندیدہ کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ اس کی جنت کی جستجو سے بڑی اور کون سی جستجو ہوسکتی ہے؟ خوف خدا سے زیادہ کون سا ڈر ہوسکتا ہے؟ انسان کی تمنا یہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ جس ابدی خسران سے وہ بچنا چاہتا ہے، اس سے اس کے اہل و عیال بھی محفوظ رہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ دنیوی مال و اسباب کے لیے جدوجہد کر کے وہ انھیں متمتع کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ دنیوی ہلاکتوں سے وہ انھیں اپنی ذاتی کوششوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے مگر اخروی خسران اور ابدی ہلاکت سے ہر شخص خود اپنی ذاتی جدوجہد ہی سے بچنے کی توقع کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے متقی اور پرہیزگار بندے ہمیشہ اس اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے بیوی بچے، ان کے اعزہ و اقربا اس صالح فکر و عمل کے وارث بن جائیں، جس سے وہ خود بہرہ ور ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اہم فریضے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝ (الشعرا: ۲۱۴)

”اور اے نبی! اپنے قریب ترین رشتے داروں کو (آخرت کی جواب دہی سے) ڈراؤ۔“

اس آیت کے نزول کے فوراً بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام اقربا اور اعزہ کو جمع کر کے انھیں نار جہنم کا خوف دلایا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ نبیؐ سے ان کی قربت انھیں خدا کے عتاب سے نہیں بچاسکتی۔ (بخاری عن ابی ہریرۃ، کتاب الوصایا)

صالح اولاد کو صدقہ جاریہ قرار دے کر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی تربیت کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ انسان کی موت کے بعد جب اس کے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے تو، جو چیزیں کام آتی ہیں ان میں ”وَلَدًا صَالِحًا“ کا بھی آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ (عن ابی ہریرۃ: ابن ماجہ)

تحریک اسلامی کے کارکنوں کا امتیاز

ہر بندہ مومن کی یہ تمنا ہونی چاہیے کہ اس کے اہل وعیال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے غیظ و غضب سے بچیں اور اس کے انعامات کے مستحق بن جائیں۔ یہی اس کی دعا ہوتی ہے اور یہی اس کی جدوجہد کا اولین مرکز۔ تحریک اسلامی کے ہر خادم کا تو خصوصی امتیاز یہی ہونا چاہیے کہ جس نصب العین کو اس نے اپنایا ہے، ساری دنیا اسے اپنا لے بالخصوص وہ افراد، جن سے وہ قدرتی محبت رکھتا ہے، جنھیں وہ لخت ہائے جگر کے نام سے یاد کرتا ہے، جن کی ہر دنیوی تکلیف پر وہ بے چین ہو اٹھتا ہے اور جن کی ہر خوشی سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی آرزو ہونا چاہیے کہ جس حق کو اس نے پہچانا ہے اور جس شعور سے وہ آشنا ہوا ہے، اس کو اپنے قریب ترین اعزہ اور اقربا تک منتقل کرے اور جس نصب العین نے اس کو سرفروشی کی تمنا بخشی ہے وہی اس کے اردگرد شعلہ جوالہ بن کر حرارت پہنچائے۔ تحریک اسلامی سے وابستگی کسی سیاسی پارٹی یا وقتی ہنگاموں میں مصروف جماعت سے وابستگی نہیں ہے کہ ان کی طرف اپنے خاندان کو متوجہ کرنا آپ کی دینی ذمے داری نہ ہو بلکہ یہ تو آخرت کا سودا ہے اور آپ اسباب آخرت کے سوداگر ہیں۔ اس سرگرمی کو باہر ہی نہیں بلکہ اپنے گھر میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ سلسلہ دعوت اگر گھر کے اندر ٹوٹ جائے تو باہر اس کا انجام معلوم ہے!

افسوس ہے کہ امت مسلمہ کے باشعور علماء اور دین دار حضرات بالعموم اس معاملے میں غفلت شعاری کا شکار ہیں مگر تحریک اسلامی کے افراد بھی رفتہ رفتہ اس بے پروائی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بے پروائی کبھی بہ ظاہر معقول عذر کے سبب سے ہوتی ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ تحریک کے اہم مسائل اور تقاضوں کے سبب ان کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ چناں چہ بیوی اور بچے یہ نہیں جانتے کہ ابا جان کس کام میں اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ چناں چہ آزمائش کی گھڑی میں ان کی طرف سے اخلاقی مدد نہیں ملتی یا جھنجھلاہٹ اور بے نیازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ بعض حضرات اپنی تمام تر توجہ دور کے لوگوں تک پیغام حق پہنچانے میں اپنی جان کھپاتے رہ جاتے ہیں اور اہل وعیال کو بھول جاتے ہیں۔

اس سہل انگاری کو ہم نے رفتہ رفتہ اس طرح بدلتے دیکھا ہے کہ تحریک اسلامی تو دور

رہی، اسلام کی دینی اور اخلاقی تعلیمات کے خلاف طرزِ عمل کو گوارا کیا جانے لگا ہے۔ بچوں کی محبت میں ہم میں سے اکثر لوگ ان کی دنیوی خوش حالی کی جدوجہد کے لیے وقت نکالتے ہیں اور اس کی فکر بھی کرتے ہیں لیکن تحریک سے عملی وابستگی پر توجہ صرف کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی سے وابستگی کی اہمیت بہرحال، ثانوی ہے لیکن دین حق کی اخلاقی تعلیمات کی پابندی کو بھی پروان چڑھانے سے گریز تو کہیں بڑا گناہ ہے۔ تقریبات میں اسراف مسلمانوں کا عام شیوہ بن گیا ہے لیکن اگر تحریکی افراد بھی بچوں کی خوشی کا بہانہ بنا کر اسراف کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس نصب العین کی خدمت ہوتی ہے یا اس کو صدمہ پہنچتا ہے؟ شادی کے معاملے میں رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

تُنۡکَحُ الۡمَرۡأَۃُ لِأَرۡبَعٍ لِمَالِهَا وَ لِحَسَبِهَا وَ لِجَمَالِهَا فَاظۡفَرۡ بِذَاتِ الدِّیۡنِ تَرِبَتۡ یَدَاکَ. (مسلم عن ابی ہریرہ، کتاب النکاح)

''عورت سے چار چیزوں کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کی جائداد کی وجہ سے، اس کی خاندانی شرافت کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کے سبب اور اس کی دین داری کی بنیاد پر تو تم دین دار عورت کو حاصل کرو۔ تمھیں خوش حالی نصیب ہو۔''

ہم غیر جانب داری سے اس امر کا جائزہ لیں کہ کیا یہی روش ہم نے اختیار کر رکھی ہے؟ آپ شاید اس تکلیف دہ صورتحال کے عینی شاہد ہوں گے کہ ہم بھی دوسروں کی طرح سب کچھ دیکھتے ہیں بہ جز دین داری کے۔ کیا دعوت حق اس طرح پروان چڑھ سکتی ہے؟ ہمارے بعض رفقائے سفر یہ کہتے ہیں کہ اہل خاندان کو بعض جلیل القدر انبیاء نہ بدل سکے اور وہ حضرت نوح علیہ السلام اور برادران یوسف علیہ السلام کی مثال دیتے ہیں۔ لیکن یہاں زیر بحث، انقلابِ احوال نہیں ہے، بلکہ کوشش ہے، اس امر کی کوشش کہ دین حق سے متعارف کیا جائے، تحریک اسلامی کا شعوری نصب العین واضح کیا جائے اور ان سے محبت کا داعیہ پیدا کیا جائے۔ افسوس اس امر کا نہیں ہے کہ افراد تحریک کے خاندانوں میں تحریکی شغف کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ افسوس اس کا ہے کہ ہم کوشش اور جدوجہد سے غافل ہیں اور وہاں بھی ہم کوشش سے گریز کرتے ہیں جہاں ہم اثر ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً غیر شادی شدہ لڑکیوں کا لباس اور ان کا طرز رہائش۔ ہم میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں،

جہاں ہم نے اپنی لختِ جگر کو ان کے حوالے کیا ہے، جو دین سے بے خبر یا بے زار ہیں۔ اُس ماحول میں جانتے بوجھتے انھیں ڈالا ہے جہاں فساد کے امکانات قوی ہیں۔ مجھے آج سے تیس برس قبل کا واقعہ یاد ہے جب کہ قاہرہ کی ایک غیر رسمی دعوت میں میرا تعارف اس وقت کے معتبر اور معروف عالم دین کی تیرہ چودہ سال کی بچیوں سے کرایا گیا تھا، جو منی اسکرٹ پہنے ہوئے اور کھلے بال تھیں۔ اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور تحریک اسلامی کے افراد میں بالخصوص اس طرح کی بے حجابی نہیں ملتی۔ مگر آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تحریک اسلامی ہند کے بعض ایسے رفقاء کے گھروں میں بھی، جنھوں نے دیارِ غیر میں قدم نہیں رکھا ہے، یہ چلن در آیا ہے تو بے ساختہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم رفتہ رفتہ کتنی دور پیچھے جا رہے ہیں۔ تحریک سے رسمی وابستگی نہ سہی، اسلامی اقدار اور اخلاق کا پاس ولحاظ تو بہت حد تک ہمارے قابو میں ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ معاشی خوش حالی کے لیے ہم غیر شعوری طور پر یا بالارادہ اپنے بچوں اور زیر اثر اعزہ کو ایسی تجارت اختیار کرنے سے نہیں روکتے، جس میں اسلامی حدود کی پامالی ہوتی ہے۔ اگر وہ سودی بینکوں میں ملازمت کر رہے ہوں تو اس سے بھی ہم نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ رشوت اور جھوٹ اب ایک حد تک ناگزیر ہو گئے ہیں۔ مگر جب ایک دین دار اور داعی حق معمولی بہانوں سے ان میں مبتلا ہو جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ اگر مسلمان بھی جھوٹ بولے، صحیح اور غلط حسابات رکھنے میں مضائقہ نہ سمجھے، جب وہ بھی خالص اشیاء میں ملاوٹ کرے، جب وہ بھی فریب اور خیانت پر مبنی زمین جائداد (Real State) کی تجارت کرے، تو آپ اس پر کیا کہیں گے؟

ان گزارشات کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم میں اکثریت اس میں مبتلا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم پہلے جتنا ان چیزوں سے گھن کھاتے تھے وہ کیفیت رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی ہے۔ عام ملت اسلامیہ تو ان برائیوں کے لیے فقہی عذرات تلاش کرتی رہتی ہے، لیکن اگر داعیانِ حق بھی اس رجحان کی پرورش کرنے لگیں تو اولاد کی تربیت کیا ہو سکے گی! خاندان میں تحریک اسلامی سے شغف کس طرح پیدا ہوگا؟ تناقض فکر و عمل کا ازالہ ہماری دعوت کے اوّلین اہداف میں شامل تھا۔ کیا اب ہم اس پر مطمئن ہیں کہ اب یہ ناممکن ہے؟ سود کے متعلق ہم نے بعض معتبر رفقائے کار سے سنا ہے کہ علماء میں اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ حالاں کہ دنیائے اسلام کے علماء کی دو معتبر تنظیموں (اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا اور هيئة كبار العلماء رياض) اور

صد فیصد اسلامی ماہرین اقتصادیات، موجودہ بینک سود کو حرام سمجھتے ہیں۔ تحریک اسلامی ہند کا تو ہمیشہ یہی موقف رہا ہے۔ ایسی حالت میں فقہی جواز کے لیے کم زور رایوں پر انحصار عزیمت سے فرار نہیں ہے بلکہ اساسی تعلیمات سے گریز ہے۔

جس تحریک دعوت کے وابستگان اپنی دعوت اور اپنے مشن کو اپنے اہل وعیال اور قریبی اعزہ تک پہنچانے میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ان پر اپنی نشو ونما کے فطری راستے بند کر دیتی ہے۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ مخاطب، اعلیٰ اور ارفع اخلاق کی باتوں کو سن کر ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ داعی کی زندگی اور اس کے قریبی سماج کی زندگی پر نظر دوڑاتا ہے اور جب دونوں کے درمیان تضاد دیکھتا ہے تو نفور اختیار کرتا ہے۔ آج کا سماج تو منافقت اور دورنگی کا شاہ کار ہے۔ یہاں تو ہر شخص سچائی، دیانت داری اور حسن اخلاق کی بات کرتا ہے مگر عمل سے مجتنب رہتا ہے۔ یہاں تو دین ودھرم کے نام پر دکان سجانے والے بھی اس کی حقیقی برکات سے خود کو محروم رکھتے ہیں۔ ایسے سماج میں تحریک اسلامی کے داعی بھی اگر قول وعمل کے تضاد میں مبتلا رہے تو ان کا اثر کیا ہوگا۔ برائی آج ایک طاقت ور سیلاب بن چکی ہے، اس کا سدباب صرف ایک طاقت ور جوابی سیلاب سے ہی ممکن ہے۔ یہ سیلاب اپنے اور اپنے قریب ترین سماج کے اخلاق وکردار ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم نے بعض ایسے مخلص ساتھیوں کو بھی دیکھا ہے، جو تحریک سے عدم اطمینان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے بچے بھی اس بے زاری کا غیر شعوری طور پر شکار ہو جاتے ہیں۔ اصلاح احوال اس طرح نہیں کی جاسکتی کہ آپ جس فیصلے اور جس اقدام کو اپنی فہم کے مطابق صحیح نہ سمجھتے ہوں اس کو حرز جان بنالیں اور خیر کے تمام دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے رفتہ رفتہ اپنے رشتے کو کم زور بھی کرتے جائیں اور اپنے ہم نشینوں اور محبوب اہل وعیال کو تحریک سے بے زار کرتے جائیں۔ یہ محض اندیشے یا بدگمانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ مجھے ذاتی طور پر ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑا ہے جہاں انتہائی مخلص افراد کی اس بے احتیاطی کی وجہ سے ان کے اہل وعیال بھی بلا کسی راست معلومات کے انھیں تنقیدوں کو دہراتے ہیں اور بالآخر تحریک سے مخالف طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر اس نتیجے کی ذمے داری کس پر ہے؟

اہل وعیال کے بعد تیسرا میدان کار ہمارے اپنے پڑوسی ہی ہیں۔ پڑوسیوں کی خبر گیری کے، جو احکام قرآن وسنت میں منقول ہیں، ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بندہ مومن کی یہ دینی

ذمے داری ہے کہ وہ عسرت میں دادرسی کے علاوہ مرض اور آفات میں ان کی دست گیری کرے۔ ان کو اپنی زبان کی شرانگیزی سے محفوظ رکھے۔ ان تعلیمات میں کہیں بھی مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ حسن سلوک کا مستحق اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی اور اَلْجَارِ الْجُنُبِ (النساء:۳۶) کو قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوکے پڑوسی سے بے خبری کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی تاکید آئی ہے کہ وہ شخص مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے، جس کی شرانگیزی سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ)

ظاہر ہے کہ جب دنیوی مال ودولت میں پڑوسی کی دست گیری اور جسمانی تکلیف میں اس کی خدمت، ایمان کی شان قرار دی گئی ہے تو مومن کی سب سے بڑی دولت کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی منشا یہی ہوگی کہ اس دولت کا وہ بدرجہ اولیٰ مستحق ہے۔ وہ شعور ایمانی اور وہ فکر ونظر، جس کو داعی دور دور تک پھیلانا چاہتا ہے، سب سے پہلے اس کا مستحق اس کا پڑوسی ہوگا۔ اسلام کے اخلاقی اقدار کی پیروی مومن کا امتیازی کردار ہے۔ اس لیے کہ اسلام اعلیٰ اخلاق، سلامتی اور عدل واحسان کا دوسرا نام ہے۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ.

''میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔''

ظاہر ہے کہ مومن کا پڑوسی اس امر کا مستحق ہے کہ وہ ان فیوض وبرکات سے مستفید ہو، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ دین حق اس کی نعمتوں کی معراج ہے، لہٰذا اس نعمت کو ان تک پہنچانا داعی کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس فضا کو پروان چڑھانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنے خطبے میں سرزنش کے انداز میں اپنے رفقاء کو مخاطب فرمایا تھا:

خطب رسول اللّٰه ذات يوم فأثنٰى على طوائف من المسلمين خيرًا. ثم قال: ما بال أقوام لا يفقهون جيرانهم و يأمرونهم ولا يعظونهم وما بال قوم لا يتعلمون من جيرانهم ولا يتفقهون ولا يتعظون؟ أو لأعاجلنهم العقوبة ثم نزل. (طبرانی)

''ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور مسلمانوں کے بعض گروہوں کی خیر سے

تعریف کی۔ پھر کہا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو نہیں سکھاتے اور امر بالمعروف نہیں کرتے اور نہ ان کو نصیحت کرتے ہیں؟ اور لوگوں کو کیا ہو گیا کہ اپنے پڑوسیوں سے نہیں سیکھتے اور نہ تفقہ حاصل کرتے ہیں اور نہ نصیحت...(اگر تم لوگوں نے ایسا نہ کیا) تو میں جلد ہی تمھیں سزا دوں گا۔''

مذکورہ بالا ارشادات پڑوسیوں کے ساتھ نہ صرف حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ ان تک دین کی دعوت پہنچانے کی بھی تعلیم دیتے ہیں اور ایسی فضا بنانا چاہتے ہیں کہ باہمی حسن سلوک اور علم و تعلیم اور وعظ و نصیحت رائج ہو۔ اگر ہم اس روشنی میں اپنی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اپنی غفلت کا شعور حاصل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں سے عام ملت اسلامیہ اور تحریکِ اسلامی کے افراد کو اپنا احتساب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم کو دعوتی سرگرمیوں کے لحاظ سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم پڑوسی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کیا ہم ان کو اپنی سرگرمیوں سے واقف کراتے ہیں؟ یا ہمارا حال اس کے برعکس ہے کہ ہم دور دراز کے علاقوں پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں لیکن پڑوس کے انسانی حقوق سے لاتعلق رہتے ہیں۔ پڑوس میں مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اول الذکر کا یہ حق ہے کہ وہ ہمارے نصب العین سے واقف ہو۔ اس کو یہ بات سمجھائی جائے کہ ملت اسلامیہ، خیر امت کیوں ہے۔ دنیا کے ہنگاموں کے دوران اس کا فریضہ کیا ہے، آج کے زمانے میں یہ بھی اسے بتانا ضروری ہے کہ دین حق صرف عبادات اور چند رسومات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ پوری زندگی کو محیط ہے اور بحیثیت ایک مومن کے، اس کی ذمے داری ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے فساد کا سد باب کرنے پر اپنی توجہ مبذول کرے اور اگر پڑوسی غیر مسلم ہے تو اس کو دین حق سے متعارف کرانا چاہیے۔ اس کو بندگی رب کی دعوت دینا چاہیے اور حکمت اور موعظہ حسنہ کے اہتمام کے ساتھ اس کو شرک اور الحاد کی ہلاکت خیزی سے واقف کرانا چاہیے۔ اس فریضے سے غفلت کی وجہ سے ہمارے غیر مسلم بھائی صدیوں سے ہمارے ساتھ رہنے کے باوجود یہ نہیں جانتے کہ قرآن کی تعلیمات کیا ہیں۔ محمد ﷺ کیا پیغام لے کر آئے تھے۔ چناں چہ کتنی بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ چند برس پہلے جب پٹنہ ہائی کورٹ نے دوران پابندی جماعت کے متعلق فیصلہ دیا تھا تو اس میں یہ جملہ بھی

تھا کہ ”یہ لوگ محمد ﷺ کی پرستش کرتے ہیں۔“ حالیہ چند برسوں میں جب جماعت اسلامی ہند نے مختلف حلقوں میں تعارف قرآن اور تعارف سیرت کی مہم چلائی تو اس دوران نہ صرف یہ کہ غیر مسلم بھائیوں کی طرف سے غیر معمولی اشتیاق کا اظہار ہوا تھا بلکہ یہ شکایت بھی کی گئی تھی کہ مسلمانوں نے ہم کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس طرح پڑوسیوں سے حسن سلوک اور محبت کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ اگر پڑوسی مسلمان ہو تو اس کے حقوق کا تفصیلی ذکر قرآن وسنت میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اگر پڑوسی غیر مسلم ہو تب بھی وہ داعی کے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے:

عن عقبة بن عامرؓ قال رسول الله ﷺ: اول خصمين يوم القيامة جاران. (مشکوۃ)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن، جن دو آدمیوں کا مقدمہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ دو پڑوسی ہوں گے۔“

ایک دوسری حدیث میں پڑوسی کے حقوق کی تفصیل بتائی گئی ہے:

أ تدری ما حق الجار؟

إذا استعانک أعنه و إذا استقرضک أقرضته و إذا افتقر عدت عليه و إذا مرض عدته و إذا أصابه خير هنأته و إذا اصابته مصيبة هذبته... إلى آخر الحديث. (عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده. ترغيب و ترهيب)

”کیا تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا کیا حق ہے؟ اگر وہ مدد کا طالب ہو تو اس کی مدد کرو، اگر وہ قرضہ مانگے تو اس کو قرضہ دو، اگر وہ فقر و فاقہ کا شکار ہو تو اس کو نفع پہنچاؤ۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کرو۔ اگر کوئی مسرت اس کو حاصل ہو تو مبارکباد دو، اگر مصیبت میں گرفتار ہو تو صبر کی تلقین کرو...“ الی آخر الحدیث

اس طرح کی حدیثوں میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف آپ کو یہ ملے گا کہ غیر مسلم پڑوسی اگر مظلوم ہو تو اس کی دادرسی کے وسائل اختیار کرو اور عمومی

احسان کی روش اختیار کرو۔ غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ اگر ہم وہ رویہ اختیار کرتے، جس کی ان تعلیمات میں ہدایت کی گئی ہے تو اس ملک میں نفرت اور عداوت کا وہ سیلاب نہ آ سکتا، جس سے آج امت محصور ہے۔ داعیان حق کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ اس دور میں بے شمار ایسی مثالیں ہیں کہ محض پڑوسی مسلمان کے حسن سلوک کے نتیجے میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ایسی افسوس ناک مثالیں بھی ہیں کہ داعیان حق کی بے پروائی اور لاتعلقی اور عام انسانوں جیسے جھگڑالو رویے کی وجہ سے غیر مسلم پڑوسی ان سے اور ان کی دعوت سے متنفر ہوئے ہیں۔

اوپر جو کچھ بھی کہا گیا ہے اسے بے جا کی الزام تراشی نہ سمجھیے اور نہ یہ سمجھیے کہ لکھنے والا ان تمام خامیوں سے خود کو مبرا سمجھتا ہے اور نہ یہ کہ ان کوتاہیوں میں خدانخواستہ تحریک اسلامی کے کارکنان کی اکثریت مبتلا ہے۔ الحمدللہ، عام امت مسلمہ میں اور تحریک اسلامی کے عام افراد میں ان تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہے، ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان پر توجہ کو ہماری ترجیحات میں اوّلین مقام ملنا چاہیے۔ وبِاللّٰہِ التَّوفِیق۔

تاریخ انسانیت اور قرآن کریم کا اعجاز

قرآن حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی تاریخ کی، جو بھی روداد بیان کی گئی ہے وہ بعد کے ہر دور پر چسپاں ہوتی ہے۔ قرآن روایتی انداز سے قصہ گوئی نہیں کرتا بلکہ حادثات اور واقعات کی اس طرح ترجمانی کرتا ہے کہ ان کی پشت پر کارفرما اساسی رجحانات اور محرکات واضح ہو جائیں۔ اس کی نظر میں تاریخی واقعات حق و باطل کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتے ہیں۔ باطل کے کڑوے اور کسیلے پھلوں کو حق پرستی کے شیریں اور خوش گوار ثمرات سے چھانٹ کر الگ کرتے ہیں تاکہ جو چاہے، پروردگار عالم کے اس خصوصی کرم سے فائدہ اٹھائے اور جو چاہے گم گشتہ اور حیران رہے۔ ان قصوں کے اندر سے وہ موتی چن لیتا ہے اور خزف ریزوں کو روک دیتا ہے۔ واقعات کے نشیب و فراز سے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ برائی کا انجام کار ہلاکت ہے۔ ظلم بالآخر سرنگوں ہوتا ہے۔ دولت آتی جاتی ہے۔ خدم و حشم باقی نہیں رہتے۔ واقعات کی اُتھل پتھل، کسی اندھے اور بے بہرہ مجموعہ عوامل کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ حکمت اور دانائی کا مظہر ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی ایسا معجزہ ہے کہ وہ ہر غالب اور مغلوب، ہر ظالم اور مظلوم، ہر قاہر اور مجبور کی ہر زمانے میں حیرت انگیز ترجمانی کرتا ہے۔ یہ اندازِ بیان نہ پہلے کبھی اَنمل اور بے جوڑ رہا ہے اور نہ آج ہے۔ اس انداز کلام میں پہلے بھی عبرت اور موعظت کا سامان رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ایمان والوں نے اس سرچشمۂ بصیرت سے پہلے بھی عبرت حاصل کی تھی اور آج بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ (یوسف:۱۱۱)

”اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔“

انقلابات زمانہ، اللہ سبحانہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا مظہر ہیں۔ کبھی کوئی سرفراز ہوتا ہے اور کبھی سرنگوں۔ ان دونوں حالتوں میں انسان کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ہر معاشرے کا طرزِ عمل اور اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ جاننا چاہتا ہے کہ کون ہے، جو سرفرازی کے دور میں اپنے خالق و مالک کا باغی بن جاتا ہے اور اس کے دوسرے بندوں پر ظلم ڈھاتا ہے، اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا نعرہ بلند کرتا ہے اور کون ہے، جو اس کی نعمتوں پر شکرگزاری کا رویہ اختیار کرتا ہے، اور پکار اٹھتا ہے:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ۝ (النمل:۱۹)

''اے میرے رب! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں، جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل کروں، جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھے صالح بندوں میں داخل کر۔''

اس حکمت بالغہ کا اظہار قرآن کریم میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ یَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۝ۙ (آل عمران:۱۴۰)

''یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں، جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں (اور کون نہیں ہیں) اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا، جو واقعی گواہ ہوں، کیوں کہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔''

قرآن حکیم اپنے بیان کردہ واقعات کے ذریعے اور اپنے انداز کلام سے ہر طرح کے انسان اور ہر طرح کے معاشرہ کے کردار کا حیرت انگیز تجزیہ کرتا ہے، اس لیے کہ وہ سب کا خالق ہے:

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ ۖ (ق:۱۶)

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔''

اپنی اس حیرت انگیز کردار نگاری کے ذریعے اس نے یہ واضح کیا ہے کہ گمراہ بندوں اور دولت وقوت کے نشے میں سرشار جماعتوں نے عام انسانیت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ہے، اپنی مادّی قوت (اور ٹکنالوجی) کے زعم میں اس حقیقت کو بھلا بیٹھے کہ ہر چیز ناپائیدار ہے بہ جز حق و انصاف اور انسانیت دوست اقدار حیات کے اور یہ کہ ہر انسان کو اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔

حق وباطل کے درمیان خطِّ امتیاز

حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے جواب میں فرعون نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ یہ شخص ہمارے مثالی طرزِ زندگی اور آئیڈیل معاشرے کو تباہ کرنے پر تلا ہے اور اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے:

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى○ (طٰہٰ:۶۳)

”آخر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی طریقہ زندگی کا خاتمہ کر دیں۔“

یعنی ہمارا طریق زندگی بہترین اور آئیڈیل ہے، جس نے ہمیں دولت بھی دی ہے اور شان وشوکت بھی۔ یہ لوگ ہماری قوت اور خوش حالی سے متنفر ہیں، اس کو بدلنا چاہتے ہیں اور ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا ان کم زوروں اور ہمارے غلاموں (بنی اسرائیل) کی جسارت تو دیکھو کہ ہمارے منہ لگنا چاہتے ہیں۔ یہ قوم تو برسوں سے ہمارے زیرِنگیں رہی ہے، اقتدار سے محروم اور مفلس وبدحال رہی ہے:

وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ○ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ○ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ○

(الزخرف:۵۱-۵۴)

''ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں۔ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ میں بہتر ہوں یا یہ شخص، جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں آیا؟ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی۔ درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ!''

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں 'سحر' کی جگہ 'دہشت گردی' کی اصطلاح رکھ دیجیے پھر دیکھیے کہ اس میں اور حالیہ مہینوں میں قوت اور طاقت سے سرشار مغرب کے الزامات میں کتنی حیرت انگیز مماثلت ہے! طَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی کے الفاظ مغرب کے غرور اور استکبار کی کیسی ترجمانی کر رہے ہیں!

۱۱؍ستمبر کے حادثہ فاجعہ کے بعد اٹلی کے وزیر اعظم نے مغربی تہذیب کے بالمقابل اسلامی تہذیب کو فروتر قرار دیا تھا۔ (جس سے وہ بعد میں خود بھی پریشان ہوئے اور اتحادیوں کو بھی پریشان کیا)۔ صدر بش نے اپنے ایک بیان میں کھلم کھلا یہ فرمایا تھا کہ یہ حملہ، امریکہ کی بہترین معاشرتی اور سیاسی اقدار اور اس کے خوش حال معاشرے پر حملہ تھا۔ یہ حملہ درحقیقت بربریت کا مہذب سوسائٹی (Civil Society) پر، جمہوری اقدار پر، حریت فکر و نظر پر اور عام خوش حالی کے خلاف تھا، جو غیر مہذب جنونیوں نے کیا تھا۔ حال ہی میں کولن پاویل نے اپنی حیرتِ اور صدمے کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کے تیسرے ممالک (بالخصوص شرق اوسط) میں لوگ ہم کو برائی اور شیطانیت کا علم بردار کیوں سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ ہم تو جمہوری قدروں، انسانی مساوات، انسانی حقوق اور صنعتی حقوق کے محافظ اور علم بردار ہیں۔ اس سے پہلے صدر ریگن اور مسٹر بش مسلمان ملکوں کے بعض قائدین کو پاگل کتا (Mad Dog) قرار دے چکے ہیں۔ مادی اور ٹکنالوجکل ترقی کی معاشی خوش حالی اور عسکری قوت کے سب سے اونچے معیار پر فائز اس ملک کے خواص کو اپنا طرزِ زندگی اور اپنا معاشرہ، مثالی اور آئیڈیل نظر آتا ہے۔ مگر وہ ان دکھوں سے واقف نہیں ہیں، جن میں امریکی عوام کی ایک معتد بہ تعداد مبتلا ہے۔ انھوں نے اپنے عوام کو اس سے بے خبر

رکھا ہے کہ پوری دنیا میں وہ ظلم اور استحصال کی قوتوں کے حامی اور مؤید رہے ہیں۔ انھوں نے ڈکٹیٹروں، بادشاہوں اور غیر جمہوری نظام کے علمبرداروں کی حمایت کی ہے۔ انھوں نے جمہوری طرز پر منتخب ایک صدر ایرانی (مصدق) کو ملک سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ ایل سلواڈور کے منتخب صدر کو بے دخل کیا تھا۔ ایرانی بادشاہ ظاہر شاہ اور ان کے جاسوسی نظام کی بے دریغ مدد کی۔ الجزائر میں جمہوری تحریک کو ناکام بنانے میں فرانس کی مدد کی۔ اسی طرح دنیا کے بیشتر ممالک میں امریکہ نے غیر جمہوری اور ظالم طاقتوں کی پشت پناہی کر کے خود کو ''جمہوریت کا علم بردار'' کہلانے کا حق کھویا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی تاریخ میں صرف جمہوریت ہی نہیں بلکہ اور دوسری اقدار کو دوسرے ملکوں میں نشو ونما دینے اور ان کے فروغ کے لیے کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس سودی سرمایہ کو ایکسپورٹ کیا تا کہ پسماندہ ممالک کے بازار میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ ہو جائے۔ اس طرح کی سب سے آخری کوشش گلوبلائزیشن ہے، جس کے متعلقات اور پھر خود اس کا ریکارڈ امریکی مفادات کے جارحانہ تعاقب سے معمور ہے۔ ہم کو یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں ہے کہ بعض سیاسی اور معاشرتی اقدار کے لحاظ سے امریکا دنیا میں ممتاز ہے، بلکہ بیشتر مسلم ممالک کے بالمقابل جمہوری مساوات، حریت فکر و نظر اور انسانی لحاظ سے بہت بہتر ہے، لیکن جن اقدار کو وہ اپنے ملک کے داخلی معاملات میں فروغ دیتا ہے، بیرون ملک ان کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ فکر و نظر کی جس آزادی کا وہ اپنے ملک میں فروغ اور استحکام کا داعی ہے، بعینہٖ اسی نعمت سے وہ دنیا کو محروم کرنے پر آمادۂ پیکار رہتا ہے۔ عدل و انصاف کے، جن اصولوں کو وہ اپنے ملک کے اندر محفوظ رکھنے کا داعی ہے، انھیں کو وہ بین الاقوامی مناظر سیاست و معیشت میں پامال کرتا ہے۔

اس دورنگی اور منافقت پر قرآن کریم کا تبصرہ پڑھ لیجیے۔ اس لیے کہ یہ منافقت ہر دور میں خدا سے بے نیاز بندوں کا شیوہ رہا ہے۔ دولت اور قوت میں مست انسانوں نے ہمیشہ اس کا مظاہرہ کیا ہے، دوغلی پالیسی کے باوجود ان لوگوں نے اپنی خوبی کا اور اپنی اقدار حیات کا اعلان کیا ہے اور آج بھی اعلان کرتے نہیں تھکتے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ○ (النساء:۴۹)

”کیا تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا، جو اپنی پاکیزگیٔ نفس کا دم بھرتے ہیں۔ حالاں کہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔“

کتنی حیرت ناک مماثلت ہے پاکیزگیٔ نفس کا دم بھرنے والے پہلے لوگوں میں اور صدر امریکہ کے اس قول میں کہ ایران، عراق اور جنوبی کوریا، برائی کے محور ہیں۔ (Axis of evil) پہلے بھی یہ غرور اور استکبار کے کلمات تھے اور آج بھی ہیں۔

پاکیزگیٔ نفس کا دم بھرنے والے اور اپنے معاشرے کی مادی و عسکری قوت سے سرشار لوگ ہم کو آج یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اسلام کو جدیدیت کا لباس پہنانا ضروری ہے تا کہ وہ سول سوسائٹی سے ہم آہنگ ہو جائے، ترقی اور معیارِ زندگی کی بلندی کی جدوجہد میں اس راہ کو اختیار کر سکے، جو امریکہ اور مغرب نے اختیار کی ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ مطالبہ وہ لوگ بھی کر رہے ہیں، جو ہمارے ملک کو قدیم سنسکرتی کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں، جن کی نظر میں اسلام ماضی پرست ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو قومی دھارے (Main stream) کا حصہ بننے سے روک رہا ہے۔ قرآن کریم کی زبان میں اس مطالبے کا بیان سن لیجیے:

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ (یونس:۱۵)

”جب انھیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کر لو۔ ان سے کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر یا تبدل کر لوں۔“

دوسری جگہ اس مطالبے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ تم ان کی خوش نودی (یا دعوتِ حق کے مزعومہ تقاضوں کے تحت) ان کی طرف جھک جاتے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِىَ
عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ
لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۳، ۷۴)

''اے نبی ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ تمھیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں، جو ہم نے تمھاری طرف بھیجی ہے تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمھیں اپنا دوست بنا لیتے۔''

آج بھی مغرب ہمیں یہ دعوت دے رہا ہے کہ تم دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ہماری طرزِ رہائش اور تہذیب سے ہم آہنگ ہو جاؤ تو تمھارے لیے دوستی کی راہیں کھلی ہیں۔ ہماری دولت کے خزانے سے تمھیں بھی عطایا اور تحائف مل سکتے ہیں ورنہ ہم تو جہادی اور دہشت گرد تو قرار دے ہی رہے ہیں یا کم از کم ان کا حلیف تو نامزد کر ہی دیں گے۔ یہ دعوت بھی ہے اور دھمکی بھی، جو کھلم کھلا ۱۵ عرب اور مسلم ممالک کے سفرا کو ۱۱ رستمبر کے واقعے کے بعد دی گئی تھی۔

اس کے پس پشت یہ الزام تھا کہ یہ لوگ فساد پھیلانے والے ہیں، جس طرح آج کے مسلمان جہادی اور دہشت گرد ہیں۔

قرآن کا ارشاد ہے:

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا
فِى الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ
نَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ
اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ ۚ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (الاعراف: ۷: ۱۲۷، ۱۲۸)

''فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے۔ فرعون نے جواب دیا: ''میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔'' موسیٰ نے اپنی قوم

سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے، اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری کامیابی انھیں کے لیے ہے، جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"

یہ آئینہ ہے، جس کا جی چاہے اس میں اپنا عکس دیکھ لے کہ وہ فرعون کا ہم رکاب ہے یا موسیٰؑ کا مخلص پیرو! جس طرح فرعون کو اپنے طرزِ زندگی پر ناز تھا اور جس انداز سے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فتنہ وفساد کا الزام لگا کر پوری قوم بنی اسرائیل کو گردن زدنی قرار دیا تھا اسی طرح کا طرزِ عمل آج مغرب اختیار کرنے پر آمادہ ہے۔

اسلام کی تبدیلی اور اس کی جدیدیت کاری میں دینی مدارس، حریفانِ مغرب کو سب سے بڑی رکاوٹ نظر آتے ہیں۔ "یہ تشدد اور فساد کا گڑھ ہیں۔ یہ ماضی پرست ہیں۔ یہ جنگجو تنظیموں اور افراد کا گڑھ ہیں۔ ان کے علاوہ مساجد میں، جن کے خطیب ماضی پرستی اور بنیاد پرستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ طالبان انھیں مدارس کے طالب علم تھے۔" اس الزام تراشی میں ہندستان کا سنگھ پریوار بھی شامل ہے۔ جنرل مشرف کی ایک تقریر پر تعریف اور تحسین کے جو ڈونگرے امریکہ میں برسائے گئے ہیں، ان کا ایک سبب ان کا یہ اظہارِ عزم تھا کہ وہ ان مدارس پر سرکاری گرفت مضبوط کریں گے۔ ان میں چن چن کر ان جرائم کو نیست و نابود کر دیں گے، جو جہادی گروپ کو غذا فراہم کرتے ہیں اور ان خطیبانِ مسجد کی زبان بندی کریں گے، جو دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں۔

دھاندلی اور جھوٹ و خیانت اور اسلام دشمنی کی سیاست کو اس کی نہ فرصت ہے اور نہ پروا کہ وہ دیکھے کہ مدارس اسلامیہ میں کیا تعلیم دی جاتی ہے، کیسے کردار تیار کیے جاتے ہیں! غریب اور پسماندہ ممالک میں کس وسیع پیمانے پر یہ ادارے فلاحی تعلیمی مراکز کا کام کرتے ہیں! ان میں اگر چند ایک گم کردہ راہ نکل گئے تو کیا سارے نظامِ مدارس کو نیست و نابود کرنا ضروری ہے؟ امریکہ، یورپ اور خود ہمارے ملک میں کتنے ہی فسادی اور دہشت گرد افراد اور گروہ ہیں، جنھوں نے جدید تعلیمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے۔ ہندستان میں قتل و غارت گری کے ذمے دار نکسلائٹس نے کس دینی مدرسے میں تعلیم پائی ہے؟ شمال مشرقی ریاستوں میں جنگجو قبائل نے کن مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی؟ بلکہ اغلب یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر نے

یونیورسٹی اور کالجوں میں درس حاصل کیا ہوگا! نیپال میں ابھی حال میں ماؤ وادی گروپوں نے سینکڑوں افراد کا قتل کیا ہے اس سے قبل شاہِ نیپال کو ان کے صاحبزادے نے بے رحمی سے قتل کیا تھا وہ تو جدید تعلیمی ادارے کا پروردہ تھا۔ کوسووا اور بوسنیا میں ہزاروں معصوموں کا قتل اور ہزاروں ناکتخدا لڑکیوں کی عصمت دری کے ذمے دار تو دور جدید کی اصطلاح میں مثقف اور تعلیم یافتہ افراد اور جماعت تھی۔ کیا ان افراد کی دہشت گردی سے ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساری تعلیم گاہیں، تمام یونیورسٹیاں دہشت گردی کی آماجگاہ ہیں؟ پھر یہ تخصیص اسلامی مدارس کے ساتھ کیوں؟ عرب نیوز کے چیف ایڈیٹر خالد المہنا کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے، جو موصوف نے صدر بش کے اس خط کے جواب میں لکھا تھا، جو انھوں نے سعودی عرب کے وزیر تعلیم کو لکھا تھا کہ سعودی عرب کے تعلیمی ادارے دہشت گردی کی پرورش کرتے ہیں۔

''اگر اسکولوں کا نصاب براہِ راست تشدد کو جنم دیتا ہے تو امریکہ کو بھی اپنے اسکولوں کے نصاب کو یکسر تبدیل کرنے کو اوّلین ترجیح دینی چاہیے۔''

چارلس وہٹ مین (Whitman) ایک یونیورسٹی کا طالب علم تھا، جس نے اپنے ہم جماعت طلبہ اور اساتذہ کو قتل کر دیا تھا اور بہتوں کو زخمی کر دیا۔ کسی سعودی اسکول کا طالب علم نہیں تھا۔ اسکولی بچے، جنھوں نے ریاض میں پرائمری تعلیم نہیں پائی تھی، کولمبائن اسکول میں قتل عام کا ارتکاب کیا تھا۔

چارلس مینسن (C. Manson) نے ظہران کے کسی اسکول میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ لینن خدا ہے اور جنھوں نے اس کے احکام کی اندھی اتباع میں قتل کی مہم جوئی کی تھی۔'' Timothy Mciegh اور UNA. Bomber نے مدرسوں میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ وہ ہزاروں لوگ، جنھوں نے Rev. Jini. Jioes کے احکام کی اتباع میں جونسٹاؤن گیانا (Guyana) میں نومبر ۱۹۷۸ء میں خودکشی کی تھی۔ دینی مدارس کے طالب نہیں تھے، ڈیویڈ قریش David koresh) 'چلڈرن آف گاڈ' کے بانی، موسیٰ ڈیوڈ، ایل ران ہیڈ برد L. Ron Hubbard.) نے ایسے طبقات اور گروہ پیدا کیے تھے، جو اندھی عقیدتوں سے سرشار اور دہشت گردی اور خودکشی کے عامل تھے۔ ان میں کسی نے بھی کسی دینی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی تھی!

فلسطین میں قہر اور ظلم کے کار پردازان نے کبھی کسی دینی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ کیا ان گم کردہ راہ نوجوانوں کی حقیقت جھٹلائی جاسکتی ہے۔ کیا ان کی وجہ سے یونیورسٹی اور کالجز بند کیے جانے چاہئیں؟ اور ان کے نصاب پر حرف تنسیخ پھیر دینا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدارس پر ضرب، درحقیقت اسلام دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ ہمارے بدخواہ حریف یہ جانتے ہیں کہ دینی تعلیم اور دینی مدارس مسلمانوں کی تہذیبی شناخت اور دینی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر انھیں ختم کر دیا جائے یا ان کی جدیدیت کاری ہو جائے تو رفتہ رفتہ ملت کی تہذیبی اور دینی شناخت ختم ہو جائے گی۔

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۝ (ابراہیم: ۴۶)

’’انھوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں، مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا۔ اگر چہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں۔‘‘

اس بحث سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے دینی مدارس میں اور ان کے نصاب میں کسی انداز کی صحت مندی اور تعمیری تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام ایک ’حرکی دین‘ ہے، ایک ابدی تحریک ہے۔ وہ جمود اور اندھی ماضی پرستی کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ارضی حقائق کا لحاظ کرتا ہے۔ لیکن دینی مدارس میں صحت مند اور تعمیری تبدیلی اور چیز ہے اور اس کا جدیدیت کے تحت مثلہ کرنا دوسری چیز!

یہ وقت ایمان و استقامت کا ہے

اس وقت ملک عزیز کی اقلیتیں اور بالخصوص مسلمان جس سنگین اور ناگفتہ بہ صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ اس ملک کے ہر دردمند اور باشعور شہری کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ بالخصوص انصاف پسند، بنیادی اور انسانی حقوق کے علمبرداروں اور مثبت سوچ رکھنے والے جمہوری اقدار کے پاسدار عناصر کے لیے موجودہ صورت ایک زبردست چیلنج ہے، جو صرف یہاں کی اقلیتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک اور سماج کے لیے تباہ کن ہے۔ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ریاست گجرات میں، جس طرح منظّم حملے ہو رہے ہیں اور ان کو کاروباری لحاظ سے جس طرح تباہ کیا جا رہا ہے اور جس منصوبہ بند انداز میں ان کا نسلی صفایا کیا جا رہا ہے اس سے مسلم زعماء، دانشوروں، علماء اور مدبروں کا فکرمند اور بے چین ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس ریاست میں امن و قانون (Law & Order) بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، جہاں پولس اور فوج کی موجودگی میں رقص ابلیسی جاری ہے اور یہ سب کچھ ریاست کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی ناک کے نیچے شہر احمد آباد میں ہو رہا ہے، جو ریاست کی راجدھانی ہے۔

تباہی، بربادی اور مسلمانوں کی نسل کشی کی داستان رقم کرنے میں گجرات کی انتظامیہ اور پولیس کا بھی اہم رول رہا ہے۔ پولیس کو نریندر مودی انتظامیہ نے ابتدا ہی میں ہدایت دے دی تھی کہ ''وہ اقلیتوں پر ہلاکت خیز حملہ کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔'' (روزنامہ ہندو، ۳/مارچ ۲۰۰۲) ۲۸/فروری کو جب احمد آباد کے چمن پور علاقے میں سابق ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری کے خاندان کے اٹھارہ افراد سمیت ہاؤسنگ سوسائٹی کے ساٹھ انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا، جن میں زیادہ تر کمسن بچے، جوان لڑکیاں اور خواتین شامل تھیں...اسی دن انکلیشور سرکل میں دلوں کو لرزا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ گھنٹوں مسلمانوں کی آبادیوں اور دکانوں

میں آگ لگائی جاتی رہی اور آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہوتے رہے، ہلاک ہونے والے اور جلائے جانے والے معصوم بچوں اور دیگر انسانوں کی چیخ پکار دور تک سنائی دے رہی تھی لیکن ان مکانوں سے صرف ایک سوفٹ کی دوری پر ایک افسر پاس کی دکان سے کرسی لے کر اپنے پولیس جوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا مرنے والوں کی چیخ پکار پر ہنستا رہا۔ جب اس افسر سے ایک ٹی وی چینل کے رپورٹر نے پوچھا کہ یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہو رہا ہے اور آپ ہنس رہے ہیں، تو اس کا جواب تھا: ''ارے، ان لوگوں کو کچھ اور ہنگامہ کر لینے دو، کیوں روڑے اٹکا رہے ہو؟ آخر گودھرا میں کوئی کم لوگ نہیں مارے گئے۔'' (امارت شرعیہ بہار کی رپورٹ، گجرات فساد ۲۰۰۲، ص ۱۸)

بی جے پی قیادت والی قومی جمہوری اتحاد (NDA) حکومت اگرچہ حکومت کی تشکیل کے بعد اپنے حمایتی گروہوں کے دباؤ میں اپنے فاشسٹ ایجنڈے سے بہ ظاہر وقتی طور پر دست بردار ہوگئی تھی اور یکساں سول کوڈ، کشمیر سے متعلق دفعہ ۳۷۰ وغیرہ کو اس نے حاشیہ پر رکھ دیا تھا مگر واقعات اور حالات بتاتے ہیں کہ ان کے ایجنڈے پر دوسرے ناموں اور شکلوں میں کام جاری ہے اور مرکزی اور ریاستی حکومت کی اسے سرپرستی حاصل ہے۔ عوام ان دونوں حکومتوں کے مشترکہ دباؤ کے آگے بے بس ہیں۔ رام مندر کی تعمیر کے اشو کو گرم کرنے اور خوش حال ریاست گجرات کے مسلمانوں کی نسل کشی اور بڑے پیمانے پر ان کی تباہی و بربادی کے پیچھے آخر ان کا خفیہ ایجنڈا کارفرما نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اس خفیہ ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آر ایس ایس اپنی مختلف ذیلی تنظیموں کو بروئے کار لاتا ہے۔ پریس کے ذریعے زہر افشانی کرنا، خفیہ سرکلرس کے ذریعے ہندو جذبات میں فلیتہ لگانا اور فسادکی اسکیمیں تیار کرنا، شاکھاؤں کے ذریعے اسلحہ چلانے کی تربیت دینا اور حکومت کے وسائل اور اختیارات کے ذریعے ان اسکیموں کو تکمیلی مرحلے میں پہنچانا ایک سوچا سمجھا عمل ہے جو برابر جاری ہے۔

فرقہ پرستی کے زہریلے بیج دوسری ریاستوں میں بھی بوئے جارہے ہیں اور ہر اس شہر کو گجرات بنانے کی تیاری ہے، جہاں مسلمان کھاتے پیتے اور خوش حال ہیں۔ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، بجرنگ دل کی بھوپال یونٹ نے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا ہوا ہے، جس کو پڑھ کر پھاڑ دینے یا جلا دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہ سرکلر اتنا زہریلا اور خطرناک ہے کہ اگر مقامی

انتظامیہ نہ جاگی اور بروقت سخت نوٹس نہ لیا تو بعید نہیں کہ دوسرے شہر بھی دیکھتے دیکھتے فرقہ پرستی کے جنون میں جلنے لگیں، خدا وہ دن نہ لائے۔ اس پمفلٹ میں مسلمانوں سے ہندستان کو پاک کرنے کی قسم کھائی گئی ہے۔ اپنے اتحاد کی قوت سے مغلوں کے نام نہاد مظالم کا بدلہ لینے پر ابھارا گیا ہے۔

بجرنگ دل کی تخریبی سرگرمیوں اور اس کی ملک وسماج دشمن حرکتوں کی بنا پر متعدد سیاسی، سماجی لیڈروں، انجمنوں اور تنظیموں نے بلا تاخیر اس پر پابندی عائد کرنے کا پہلے ہی مطالبہ کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں بلکہ انھیں پوٹا کے تحت گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بجرنگ دل کے رہنما اور کارکنان کھلے بندوں اور خفیہ طریقوں سے ملک کے امن وامان کو غارت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حکومت کی ذمے داری ہے کہ ایسے تمام عناصر کو بلا تاخیر گرفتار کر کے انھیں قرار واقعی سزا دے۔ ایسی سزا، جو دوسرے مفسدوں اور سماج دشمن عناصر کے لیے تازیانۂ عبرت ہو۔ اگر حکومت ان سے چشم پوشی کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں اور یہاں کی دیگر اقلیتوں کے تئیں سنجیدہ نہیں ہے اور نہ اسے ملک کا امن وامان عزیز ہے، وہ ہندتوا دا ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

مسلمان علماء، عوام اور ان کے قائدین اور دانشوروں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ ایسا نازک موقع ہے کہ اس میں تھوڑی سی بھی جذباتیت انھیں بڑی آزمائش سے دوچار کرسکتی ہے۔ انھیں بہت ٹھنڈے دماغ سے مستقبل کا لائحہ عمل اور حکمت عملی وضع کرنی ہوگی۔ شر انگیزیوں کا جواب صبر وتحمل اور شائستگی سے دینا ہوگا، جنون کا جواب عقل وحکمت اور دانائی سے دینا ہوگا۔ اپنے دفاع (Self Defence) کا حق دنیا کا ہر قانون دیتا ہے۔ مسلمانوں کو بھی انھیں ان کے اس قانونی حق کے استعمال سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کا دفاع کرتے ہوئے قتل ہو جانے والے کو زبانِ رسالتؐ نے شہید کا درجہ دیا ہے:

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ نَفْسِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ.

’’جو لوگ اپنی جان کو بچانے کے لیے قتل کردیے جائیں وہ بھی شہید ہیں، جو لوگ اپنے مال کو بچاتے ہوئے قتل ہو جائیں وہ بھی شہید ہیں اور جو لوگ اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہوئے مار ڈالے جائیں وہ بھی شہید ہیں۔‘‘

ہماری بنیادی ذمّے داری

یہ ہمارے لیے کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک ساتھ رہنے والے، ایک ساتھ کاروبار کرنے والے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے والے، ایک دوسرے کی تکلیف سے رنجیدہ اور ان کی خوشی سے خوش ہونے والے لوگ شر پسندوں کی گھناؤنی سازش کا شکار ہوکر پڑوسی کا گلا کاٹتے ہیں اور اس کا گھر جلاتے ہیں۔ گجرات کے فساد نے تو انسانوں کو گھروں میں بند کرکے زندہ جلا کر ایک نئی تاریخ مرتب کی ہے۔ ہمارے وزیر داخلہ نے ۷۲ گھنٹے میں صورتِ حال پر قابو پالینے کا دعویٰ کرکے مودی سرکار کو کلین چٹ دے دی اور وزیر اعظم نے گوا کی تقریر میں اسلام کی دو قسمیں بتا کر علانیہ ساری ذمے داری مسلمانوں کے سر ڈال دی ہے۔

بہر صورت ہم میں سے ہر حساس اور دردمند شہری کی یہ بنیادی ذمے داری ہے کہ ممکنہ حد تک فساد کے سوتوں کو بند کرے، مسموم فضا کو نارمل بنائے، جن ذہنوں اور دماغوں کو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے گمراہ اور پراگندہ کیا گیا ہے، انھیں حکمت اور دل سوزی سے پاک صاف کرے۔ دنیا میں شر محض کا وجود نہیں ہے اور نہ دنیا شر پر قائم رہ سکتی ہے، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس لیے ہمیں صبر اور حکمت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنا چاہیے، سننے والے کان اور سوچنے والے دل اور دماغ اس معاشرے میں بہر حال موجود ہیں، قرآن کی ہدایت ہے:

وَلاَ تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلاَ السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ○ وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلاَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلاَّ ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ○ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ○ (حٰمٓ السجدة: ۳۴-۳۶)

”نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے رفع کرو، جو بہترین ہو تو دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ، جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

گجرات کی یہ خوں آشامی، انسانوں کی یہ بربریت اور شقاوت، مذہب اور دھرم کے مقدس نام پر کی جارہی ہے۔ ایوان اقتدار کی مجرمانہ خاموشی اور موجودہ حکومت کی اندھیاری گلیوں میں رچی جانے والی یہ سازشیں، سب کچھ عقیدہ، سنسکرتی اور دھرم کے تحفظ اور استحکام کے لیے زیرعمل ہیں، جیسا کہ آر ایس ایس کے لیڈر سدرشن کے بیانات سے ظاہر ہے، اور جس کی صدائیں وی. ایچ. پی کے شعلہ بیان جنرل سکریٹری توگڑیا کے اعلان سے بلند ہورہی ہیں، جس کا اظہار شاعر وزیراعظم کی ان زہرافشانیوں سے ظاہر ہے، جو امریکہ سے شروع ہوکر یوپی سے ہوتی ہوئی، گوا کے بیان پر منتج ہوئی ہیں۔ یہ دور حاضر کے انسانوں کی بدنصیبی ہے کہ زہریلی اور قاتل سیاست، مذہب کے نام پر کھل کھیل رہی ہے۔ یہ سیاست ہے بی جے پی کی انتخابی سیاست، جس کی ابتدا سازش ہے، جس کا درمیانی مرحلہ بربریت ہے اور جس کا انجام ظالموں کے نقطہ نظر سے اقتدار پر بلاشرکت غیرے قبضہ ہے۔ بی جے پی نصف صدی سے ہندستان کے مخلوط سماج میں جمہوریت کے ذریعے قبضہ کرنے کا خواب دیکھتی رہی، مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر اس وقت ہوا جب کہ رام مندر کے نام پر پورے ملک میں تعصب، نفرت اور انتقامی جذبات کے شعلے بھڑکائے گئے، دل پھاڑے گئے، محبتوں کو پیروں تلے روندا گیا، ہندستان کے عوام کی صدیوں کی رواداری کے پرخچے اڑادیے گئے۔ مگر الیکشن کے بعد جب بی جے پی پر یہ عقدہ کھلا کہ نفرت اور سیاست کے اس کھیل کے بل بوتے پر حکومت بنائی نہیں جاسکتی تو سازشوں اور دوغلی سیاست کے ذریعے، اقتدار کے بھوک کی ماری دوسری جماعتوں کو ساتھ لیا گیا۔ مرکز میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھارتی سنسکرتی کے مقدس نام پر تعلیم کا بھگواکرن کرانے کی جدوجہد شروع کی گئی۔ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی شناخت کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کے دوررس اقدام کیے گئے اور بالآخر اس جدوجہد کا آخری مرحلہ گجرات کے قتل عام سے شروع ہوگیا۔

مذہب کی اصل روح انسانوں کا احترام ہے

یہ سیاست کا گھناؤنا کھیل ہے، جس کو دھرم اور سنسکرتی کے نام پر کھیلا جارہا ہے اور آئندہ کب تک کھیلا جائے گا۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو معلوم ہے، مگر اس کھیل میں دھرم کی اخلاقی اقدار، کچلی جارہی ہیں۔ دھرم، عمارتوں کا نام نہیں ہے، لباس اور طرزِ معاشرت کو نہیں کہتے، نہ یہ

کسی مخصوص جاپ اور کلمے سے عبارت ہے، بلکہ مذہب کی اصل روح انسانوں کا احترام ہے، محبت، مروت اور شفقت ہے۔ یہ دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کو درندہ نہیں بناتا، بلکہ درندوں کو احترام آدمیت سکھاتا ہے۔ اگر بھکشوں، سادھوسنتوں، رام سیوک اور رام کا نام جپنے والے، یا خداوند بزرگ و برتر کا ذکر کرنے والے، انسانوں کا گلا کاٹنے لگیں، ان کو زندہ جلانے لگیں، ستی ساوتری کے تقدس کو حرز جان بنانے والے اپنے دھرم سے باہر کی عورتوں اور بچیوں کی عصمت کے پھول کو مسل ڈالیں تو وہ دھرم اور مذہب کے نام پر شیطان کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حرکتوں سے ان کے دھرم کا نام اونچا ہوگا۔ مگر یہ سب دھرم کی موت ہے، اس کا کریا کرم ہے۔ ہم سب درندوں کو بلاوجہ بدنام کرتے ہیں، درندہ تو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے دوسرے جانوروں کا شکار کرتا ہے، مزہ لینے کے لیے وہ معصوموں کو ذبح نہیں کرتا۔ آپ نے درندوں کو کبھی بربریت اور خوں آشامی کا ننگا ناچ ناچتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ مگر دھرم اور مذہب کے علمبرداروں نے زندہ جلتے ہوئے انسانوں کی لاش پر رقص و نغمہ کی محفل سجائی۔ اپنے دھرم سے باہر خواتین سے کھلم کھلا زنا کرنے پر ابھارا، (جیسا کہ بجرنگ دل کے حالیہ اشتہار میں مذکور ہے) اور دعویٰ یہ کرتے رہے کہ اس طرح بھارتی سنسکرتی کا دفاع ہوگا اور ہندو دھرم کو فروغ حاصل ہوگا۔ یہ کیسی مذہب پرستی ہے؟ یہ ایشور، رام اور خدا کی تعلیمات کا کیسا احترام ہے؟ کیا بربریت اور بے رحمی کی کھیتی پروان چڑھانے سے ایشور اور خداترسی کے پھول کھلتے ہیں؟

ہم یہ نہیں سمجھتے کہ گجرات اور ہندستان میں بسنے والے سارے ہی لوگ ان حرکات کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم اور مسلم انصاف پسندوں، انسانیت نوازوں اور خداترس لوگوں نے بربریت کی اس داستان کی مذمت کی ہے، مگر ظلم و انصافی کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں سب سے آگے ان حضرات کو نظر آنا چاہیے، جو دھرم سے وابستہ ہیں۔ کیا یہ ایک تلخ حقیقت نہیں ہے کہ سادھوسنتوں، دھرماتماؤں اور ہندو دھرم کے تقدس مآب حلقوں سے مذمت کی آوازیں نہیں اٹھائی گئیں۔ جرم اور زیادتی کی یہ خاموشی اس میں بلاواسطہ شرکت ہے۔ احمد آباد کے تعلیم یافتہ مڈل کلاس نے بھی مکمل خاموشی اختیار کی ہے۔ بلکہ متعدد رپورٹوں کے بہ موجب، ان میں ایک معتد بہ تعداد نے عملاً لوٹ مار میں شرکت اختیار کی ہے۔ سچ ہے کہ جدید تعلیم بزدلی اور مصلحت پرستی سکھاتی ہے، وہ عافیت کوشی کا سبق دیتی ہے۔ جدید نصاب

نفرت کی چنگاری کو ہوا دیتا ہے، سماج کے سینے میں شگاف پیدا کر کے انسانیت عامہ کو تقسیم کرتا ہے۔

کیا ہم تمام مذاہب کے ماننے والوں سے یہ درد مندانہ اپیل کرنے میں حق بہ جانب نہ ہوں گے کہ وہ دھرم اور مذہب کو سیاست دانوں کی دست برد سے بچائیں۔ طالع آزماؤں کو دین دھرم کا استحصال نہ کرنے دیں۔ رام کی لاج رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہستی کے مقدس نام کو اپنی جیبیں بھرنے اور معصوموں کا گلا کاٹنے اور کم زوروں کا گھر جلانے اور اس طرح سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہ استعمال کریں۔ دھرم تو انسانیت کا بہترین ورثہ ہے، اس کو ابلیس کی خدمت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں۔ رام مندر کی مہم جس طرح چلائی گئی اور جس طرح اس کی آڑ میں نفرت وعناد کے شعلے جلائے گئے۔ وہ اپنی داستان آپ سناتے ہیں۔ داستان بینک بیلنس بھرنے کی، غلط عناصر کو یہ موقع دینے کی کہ وہ حقیقی اور مخلص دھرم پرستوں اور خداترس دین داروں کو حاشیہ پر لگادیں۔ ہر صاحب نظر کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ اس لڑائی کو سیاست نے ہوا دی ہے۔ یہ دھوکا، جھوٹ اور فریب کا کھیل ہے، جس کے شور و ہنگامہ میں حقیقت چھپ گئی ہے۔ جھوٹ کا ایک سیلاب ہے، جس میں شرافت اور شائستگی بہہ گئی ہے۔ اس سیلاب کا ہدف مسلمان ہے، ہر مسلمان جہادی ہے اور خونخوار ہے، جب کہ مسلمان یہ بتاتا ہے کہ جہاد کا تصوّر ایک پاکیزہ اور اعلیٰ تصور ہے، جو زندگی کی ہمہ گیر جد وجہد پر مشتمل ہے۔ جس کا اوّل و آخر دین کا ابلاغ اور ترسیل ہے۔ اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا ہے، اور سب سے پہلے مسلمان کی زندگی میں۔ اس کا ہدف کبھی بھی غیر مسلم عامۃ الناس نہیں ہیں۔ الاّ یہ کہ مسلمان مظلوم ہوں اور ان کو اپنے دین پر مبنی اور اپنا پسندیدہ نظام قائم کرنا ناممکن بنادیا جائے۔ پھر ہندی مسلمانوں کی تاریخ اس کو رد کرتی ہے۔ پھر یہ جھوٹ بولا گیا کہ مدارس، دہشت گردی کے اڈے ہیں۔ بنیاد پرست ہیں، ISI کے ایجنٹ ہیں اور ملک دشمن ہیں۔ یہ شور ہر سطح پر اتنی زور سے مچایا گیا کہ عام ہندستانی خوف میں مبتلا ہوگیا، جب کہ کسی بھی حکومتی ادارے نے غیر جانب داری سے اس کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مسلمان بے چارے یہ کہتے رہے کہ مدارس کے بوریہ نشیں اساتذہ دین اور انسانیت کے چراغ جلاتے ہیں، وہ اخلاق اور خداترسی کا سبق سکھاتے ہیں، وہ اس چیرہ دست دنیا میں ہزاروں اور لاکھوں مفلس نوجوانوں کو خالص فلاحی بنیادوں پر تعلیم دیتے ہیں۔ یہ مشہور کیا گیا کہ ہر مسلمان چار شادی کرتا ہے، اور منصوبہ بند طریقے

پر ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی بڑھانا چاہتا ہے، جب کہ حکومتی اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادی کرنے والوں کا فی صد تناسب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں میں ہے۔ یہ بھی جھوٹ پھیلایا گیا اور اب بھی پھیلایا جارہا ہے کہ خواتین کی حرمت اور عصمت مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے، جب کہ اعداد وشمار اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ یہ جھوٹ بولا جارہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر کہ سیکولرسٹ، مسلمانوں کی منہ بھرائی کررہے ہیں، حالاں کہ حکومتی اور نجی شعبے میں مسلمانوں کا تناسب صرف ۲-۵ فیصد ہے اور آبادی ۱۵ فیصد ہے، مسلمانوں کی بستیاں گندے سلم ہیں۔ پرائمری اسکول بھی مسلمان بستیوں میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ روشنی کا معقول انتظام نہیں ہے، معاشی سہولتیں کاغذ کی زینت ہیں۔ عام مسلمانوں کی غربت اور افلاس اور بے روزگاری کا تناسب دلت طبقات سے اکثر جگہوں پر صرف ایک درجہ اوپر ہے اور بعض جگہوں پر دلت سے بھی نیچے ہے! یہ بھی جھوٹ بولا جارہا ہے کہ سارے فسادات مسلمان شروع کرتے ہیں، جب کہ مالیگاؤں فساد انکوائری کمیشن اور سری کرشنا کمیشن جیسے دو معتبر ادارے اس کے بالکل خلاف رائے دے چکے ہیں۔ یہ جھوٹ کا طوفان کون گڑھ رہا ہے؟ اس کا فائدہ کس کو مل رہا ہے؟ یہ تو عمومی جھوٹ ہے۔ فسادات کو ہوا دینے میں کس طرح جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف دو واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ کچھ برسوں پہلے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی میڈیکل کالج کے متعلق مشہور کیا گیا کہ چھ ہندو مریض میڈیکل کالج اسپتال میں ماردیے گئے۔ جب ضلع کلکٹر کے ذریعے اس کی تردید کی گئی تو اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اسی طرح گودھرا کے فسادات کو ہوا دینے میں اس افواہ کا ہاتھ بھی تھا کہ چھ یا آٹھ ہندو لڑکیوں کی عصمت دری کرکے ان کو ماردیا گیا اور ایک درگاہ میں ڈال دیا گیا۔ تعلیم اور تعلیمی نصاب بھی جھوٹ کی اس فضا میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بالخصوص سماجی علوم کے نصابوں کے عناصر!

دھرم صداقت کا علم بردار ہوتا ہے

مجھے نہایت دردمندی سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی ہے کہ جھوٹ سے سچ کو فروغ نہیں حاصل ہوتا۔ دھرم، صداقت کا علمبردار ہے، اس کا فروغ اور استحکام صرف سچ سے ہوسکتا ہے، جھوٹ سے اس کی کھیتی سیراب نہیں ہوتی۔ دین ودھرم کے مخلص علمبرداروں کو اس پر

متنبہ ہونا چاہیے کہ جس سچ اور صداقت کا فروغ وہ چاہتے ہیں وہ جھوٹ اور دروغ بافی سے ممکن نہیں۔ خیانت، دھوکہ اور غلط گوئی سے اس کی خدمت نہیں ہوسکتی۔ یہ تو صرف ہندو دھرم نہیں بلکہ نفس مذہب اور اخلاق کی موت ثابت ہوں گے۔ کیا اب بھی یہ وقت نہیں آیا ہے کہ دھرم کے ماننے والے اور سچے پیروکار مل کر اس نعمت عظمیٰ کے استحصال پر حصار باندھیں۔ یہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سب کا اوّلین فریضہ ہے۔ اگر وہ اخلاق اور انسانیت ہی سیاسی داؤ پیچ کی بارگاہ پر بھینٹ چڑھا دیے گئے تو مذہب و دھرم کو عمومی شکست ہوگی۔ چاہے ہزاروں مندر بن جائیں اور سیکڑوں شاندار مساجد، گرجا گھر اور گردوارے تعمیر ہو جائیں۔

ایک مہذب اور سول سوسائٹی کا قیام صرف دھرم اور مذہب والوں کا فریضہ نہیں ہے بلکہ ہر دردمند، صاحب نظر اور انسانیت دوست عنصر کی ذمے داری بھی ہے۔ اس ملک میں ایک صاف ستھری، روادار، انسانیت نواز سماج کی تعمیر ہم سب کا مشترکہ خواب ہی نہیں ہے، بلکہ ہم سب کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ اس ملک کی بھلائی اس حقیقت کے ادراک میں مضمر ہے کہ یہاں مختلف عقائد اور متنوع سماج ہے۔ ہم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہندستانی سماج کے اس متنوع کردار اور اس کی رنگارنگی کو قتل و غارت گری اور نسل کشی کے ذریعے بدلنا ناممکن ہے۔ نہ اکثریت اس حقیقت کو بدلنے پر قادر ہے اور نہ اقلیت! قتل و غارت گری اور تشدد سے جوابی قتل و غارت گری جنم لیتے ہیں۔ آپ زور زبردستی سے انسان کے جسم پر حکومت کر سکتے ہیں اور ایک عرصے تک ان کو مطیع فرمان بنائے رکھ سکتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے، ان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود نہیں کر سکتے۔ اس کا ثبوت حال کی تاریخ بھی دیتی ہے۔ کمیونزم کے جبر و استبداد کے باوجود وسط ایشیا کی ریاستوں کے لوگ اور وہاں کی مسلمان اقلیتیں برقرار رہیں۔ چیچنیا کے مسلمان زندہ رہے ہٹلر کے قتل عام کے باوجود یہودی ملت زندہ بھی رہی اور اس نے مختلف میدانوں میں بے پناہ ترقی کی۔ چین کے کلچرل پروگرام کی خون آشامی کے باوجود وہاں اقلیتیں زندہ رہیں اور پھر سے ابھر رہی ہیں۔ برما کے روہنگیا مسلمان بھی نیست و نابود نہ کیے جاسکے۔ اس طرح کے واقعات سے ماضی کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اس لیے کسی کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ گجرات جیسے قتل عام سے مسلمان اس ملک سے ختم ہو سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی اصل قوت ان کا ایمان ہے، ان کا اپنے

پروردگار پر بے پناہ اعتماد ہے۔ ایک قریبی تاریخ افغانستان کی ہے، روس نے پورے دس سال افغانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی مگر بالآخر ناکام رہا ہے۔ امریکہ کی کارپٹ بمباری کے نتائج ابھی سامنے نہیں آئے ہیں، مستقبل میں محفوظ ہیں۔

اس کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس ملک کی تاریخ، اس کا کلچر، اس کی عمارتیں، اس کی زبان اور طرزِ معاشرت کے ہر ہر جز میں یہاں کے بسنے والے تمام مذاہب کے ماننے والوں کا حصہ رہا ہے۔ اس ملک کی بوقلمونی اور رنگارنگی، اس ملک کی مخلوط سوسائٹی کا کرشمہ ہے۔ یہاں کے مستقبل کا انحصار بھی ہندو مسلم سکھ عیسائی کے خوش دل تعاون اور جدوجہد پر ہے۔ کتنے کم نظر ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی صفائی سے اس ملک کو فروغ اور استحکام حاصل ہوگا! تاریخ کے محققین بہ خوبی یہ جانتے ہیں کہ لباس سے لے کر زبان تک، سماج سے لے کر تاریخ نگاری تک، ملک میں سیاسی طوائف الملوکی سے لے کر متحدہ ہندستان بنانے تک، شعر ونغمہ سے لے کر ادب و زبان تک۔ سب میں مسلمانوں کا کلیدی حصہ رہا ہے، اگر مسلمانوں کو اس ملک سے مٹا دیا جائے (خدانخواستہ) تو، ملک کی ثقافت غریب تر ہو جائے گی، امیر نہیں۔ اگر رواداری کا تیا پانچا کر دیا گیا تو دائمی نفرت پھیلے گی۔ تعاون کے بجائے انتقام کا جذبہ پرورش پائے گا۔ کچھ لوگ یہی چاہتے ہیں، مگر نادان ہیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ ان کے پروگرام سے ملک کو ترقی حاصل ہوگی۔

مسلمان ملت بالخصوص مسلم نوجوان، گجرات کے حالات سے شدید غصہ اور غم کا شکار ہیں۔ اُن کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، اور جب انسان بے بس ہوتا ہے، اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی پونجی لوٹ لی جاتی ہے اور اس کی ماؤں، بہنوں کی عزت پامال ہوتی ہے اور ان کے بھائی بہن، شوہر قتل کیے جاتے ہیں تو وہ اپنی تعمیری صلاحیت کھو دیتا ہے اور جرم وتشدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مسلم معاشرہ کے بہت سے افراد اسی صورت حال میں مبتلا ہیں۔ مایوسی کا ایک کابوس ہے کہ مسلط ہو جاتا ہے۔

مگر مردِ مومن اپنے اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس کے ایمان کی شان ہی رجائیت اور پراُمیدی ہے۔ مومنین صادقین اپنے رب پر بے پناہ اعتماد رکھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں دنیا کے حشم وخدم ہیچ ہیں اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قوت ساری قوتوں

سے بالاتر ہے، اور اس کے اذن کے بغیر دشمن ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ ان کو معلوم ہے کہ حالات زمانہ کی تنگی اور کشادگی۔ دونوں ہی کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان کو ضرب پہنچتی ہے تو یہ ضرب ایسی ہے جیسے کہ سونا بھٹی میں تپایا جاتا ہے، اور اگر مسرت اور کشادگی کے لمحات میسر آتے ہیں تو وہ بھی آزمائش کی گھڑیاں ہیں، جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے چند لمحوں کی مہمان ہیں۔

ان کے مالک اور پروردگار نے ان کو یہ بشارت سنائی ہے کہ چیرہ دستوں کے آلات حرب اور باطل قوتوں کے بالمقابل وہ ان کی مدافعت کرتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ اٰمَنُوْا ۭ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝ (الحج:۳۸)

''یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے، جو ایمان لائے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ عزیز و حکیم کی یہ پشت پناہی اور اس کی نصرت، اس کی حکمت بالغہ کا مظہر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مومنین مخلصین کی جماعت کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے مالک پر ایمان لائے ہیں۔ وہ اس کی قدرت اور طاقت کو سارے جھوٹے خداؤں سے برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ سرفروشوں کا گروہ ہے، جنھوں نے ایمان کی بارگاہ میں اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کا سودا کر لیا ہے۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحج:۴۰)

''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ''ہمارا رب اللہ ہے۔'' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں، گرجا، معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا، جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔''

یہ مالک کائنات کا کرم ہے کہ اس نے کم زور اور مظلوم مومنین کو اپنا مددگار اور حلیف

قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ یقیناً ان کی مدد فرمائے گا۔ وہ مومن بندوں کا مولیٰ ہے، حامی و ناصر ہے۔ جب کہ منکرین خدا کا بھروسا صرف اپنی مادّی شان وشوکت اور عسکری قوت پر ہے، جو کہ موہوم سہارے ہیں، غیر مستحکم اور ناپائیدار سہارے ہیں۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ○ (محمد: ۱۰،۱۱)

''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے، جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر اُلٹ دیا، اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔''

ایک طرف وہ لوگ ہیں، جو اپنی عقل وتدبیر کے بھروسے پر ظلم کے ہتھیار چلاتے ہیں۔ وہ عقل اور تدبیر، جس کے خمیر میں دھوکا اور جس کے وسائل کی رسائی محدود ہے، ایسے گروہ جو فولاد کی طاقت کو اصل طاقت سمجھتے ہیں اور سکوں کی کھنک سے وارفتہ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بہ ظاہر وہ بے دست و پا گروہ ہیں، جن کو اپنے زور بازو پر نہیں بلکہ ان تمام قوتوں، وسائل اور تدابیر پر اعتماد ہے، جس نے سب کچھ خلق کیا اور اس کے تناسب مقرر فرمائے۔ (خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا) اس مالک کائنات نے اس گروہ سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان کی نصرت اس نے اپنے اوپر لازم کر لی ہے:

وَ كَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ○ (الروم: ۴۷)

''اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔''

اس کے بالمقابل گردش لیل ونہار کی تاریخ اس امر کا قطعی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ظلم وسرکشی اور جرم طاغوت کے مجرموں کو ان کے کرتوتوں کی قرار واقعی سزا دی ہے۔ اس سزا کو ٹالنے کی قوت کسی کے پاس نہیں (یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ) اور

وَلَا يُرَدُّ بَاسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ○ (یوسف:۱۱۰)

''اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔''

اپنے عزیز اور مقتدر خدا کی رحمت سے مایوسی ایمان کی شان کے منافی ہے:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ○ (یوسف:۸۷)

''اور اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔''

البتہ اس کی شرط یہ ہے کہ اس خدائے برتر سے اپنی تمام آرزوئیں اور التجائیں وابستہ کی جائیں۔ اس کے حضور استغفار کا دامن پھیلایا جائے، چشم تر کا نذرانہ پیش کیا جائے کہ

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اس کی اطاعت شعاری، اس نصرت خداوندی کی شرط ہے، جس کا وعدہ مومنوں سے کیا گیا ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے اور صرف استغفار کی گردان کرنے کی تلقین نہیں کرتا۔ یہ دنیا اسباب اور علل کی دنیا ہے، اس لیے اس دنیا میں وہ سب کچھ کرنا ہوگا، جس سے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور دنیا کی تقدیر بدلتی ہے۔ قرآنی آیت وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کی تعلیم اس کی دلیل ہے۔ صبر اس کا زادِ راہ ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکمت سے فائدہ اٹھا کر ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، جس سے حریفان امت کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ یہ ایک نرم چارہ نہیں ہے، جو چاہے اور جب چاہے، اس کو لقمۂ تر بنا لے۔ جہاں ایک طرف ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا ضروری ہے کہ جس کے نتیجے میں اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کہ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا وہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ ایسا جائزہ جس کا محرک اصلاح احوال ہو۔

اللہ کے پیارے نبی ﷺ نے یہ انتباہ دیا تھا کہ یہ ملت اپنے دور زوال میں وہ طرزِ زندگی اختیار کرے گی، جو خدا کے دین کے منکرین یہود نے اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہ تنبیہ کی ہے کہ تمھیں ہر طرح کے نقصان سے آزمائیں گے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ تاکہ تمھیں اور تمھاری صداقت ایمانی پرکھ سکیں۔ پھر جس نے بھی صبر اور استقامت اختیار کی اسے بشارت بھی دی ہے۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ہم اپنا احتساب کرتے رہیں۔ اس صورت حال میں یہ احتساب امر لازم ہے۔

احتساب صرف چند رسمی امور کے بارے میں ہمارے رویے تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس فرض منصبی کے متعلق ہماری غفلت اور سہل انگاری تک وسیع ہونا چاہیے۔ یہ ملت شہادت حق کا فرض انجام دینے کے لیے برپا کی گئی ہے، اس نقطۂ نظر سے اپنی غفلت کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہم نے اپنے قول سے اور اپنے رنگ ڈھنگ سے اس ملک میں کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا ہے یا دے رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جھوٹ اور باطل کردار میں فرق ہے اس لیے جب صداقت اور حق کا اعلان کیا جاتا ہے تو جہالت اور طوفان کذب و دروغ گوئی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

یہ وقت ایمان و استقامت کا ہے، استغفار اور استمداد کا ہے، خدا کی طرف رجوع کرنے کا ہے اور ساتھ ہی ان تمام تدابیر کے اختیار کرنے کا ہے، جس سے ہماری مادّی کم زوری، غفلت شعاری اور بے ڈھنگے طرزِ عمل کا سدباب ہو سکے۔

کلمۂ حق کو اللہ کی تائید کا وعدہ

باطل کے خلاف اسلام کا اصل محاذ اس کے کلمات کی صداقت، اس کے اقدار کی عدالت، اس کے متبعین کا کردار اور اس کے فیضان علم کی بارش رہی ہے۔ یہی اس کے میدان کارزار رہے ہیں۔ انھی کے ذریعے سے اس نے ظن و گمان کے بادل چھانٹے ہیں اور حق و صداقت کا پرچم لہرایا ہے، انسان کے قلوب کو مسخر کیا ہے۔ باطل کی تاریکیوں کو حق کی روشنی میں تبدیل کیا ہے۔ جہل کا ازالہ کر کے انسانیت کو علم کی تابندگی بخشی ہے۔ کردار کی بے راہ روی کو دور کر کے اس کو صراط مستقیم پر گامزن کیا ہے اور ان ہتھیاروں کے سامنے باطل نے ہمیشہ راہ فرار اختیار کی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس نہج پر محاذ آرائی کی تعلیم دی تھی اور دنیا نے چند برسوں میں دیکھ لیا کہ فِئَةٌ قَلِيلَةٌ (مختصر گروہ) غالب آ گیا۔ قلت، کثرت میں تبدیل ہوگئی اور ضعف، قوت میں بدل گیا۔ جس طرح حق کو اس دور میں اللہ سبحانہ کی نصرت سے فتح و کامرانی ملی تھی اسی طرح آج بھی مل سکتی ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل میں اسلام کی لڑائی ہتھیاروں اور جدید ٹکنالوجی کے بل بوتے پر ہوگی، وہ اس دین کی اصل قوت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں اور حق تعالیٰ کی نصرت اور اس کی کارفرمائی کو دنیا کی سیاست اور عسکری قوت پر قیاس کرتے ہیں: وَمَا قَدَرُ اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ۔

دین حق کی لامتناہی قوت کا سرچشمہ قرآن کریم تھا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں فکر کے ایسے خزانے مضمر رکھے ہیں، جس نے انسانیت کو رفعت اور عظمت کے مقام اعلیٰ تک پہنچایا تھا۔

جہل اور حیرانی و سرگشتگی کے قعرِ مذلت سے نکال کر اس کو علم صداقت کی راہ پر گامزن کیا تھا۔ تدبیر اور جدو جہد کی ایسی کلید عطا کی تھی کہ باطل کو بھاگنا پڑا۔ جہل کے بت سرنگوں ہو گئے۔ اس نے قران کی تلاوت کرنے اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے پیغمبر ﷺ کو ایسی زبان حکمت شعار عطا کی تھی کہ وہ دلوں پر براہِ راست اثر کرتی تھی۔ جدید زبان میں قرآن کریم بے مثال فکری تحریک (Intelectual Movement) تھی، جس کی جڑیں اخلاق اور انسانیت دوستی میں پیوست تھیں اور پوری کائنات پر اپنی رحمت سے سایہ فگن ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّھَا. (ابراہیم: ۲۴)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔''

قرآن کے اس ارشاد کے بہ موجب یہ ایسا کلمہ تھا، ایسی فکر تھی، جس کو ہمیشگی عطا کی گئی ہے اور جس کے ثمرات پر کبھی خزاں نہیں طاری ہو سکتی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ وَ یُحِقُّ اللّٰہُ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (یونس: ۸۱، ۸۲)

''مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا اور اپنے کلمات سے وہ حق کو حق کر دکھاتا ہے خواہ وہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔''

یہ آیت قصۂ موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے کہ جادوگر کتنے ہی حیلے کیوں نہ آزمائیں، ان کو اللہ کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اس کے برعکس اپنے کلمات سے وہ حق کو حق کر دکھاتا ہے:

وَ یَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (الشوریٰ: ۲۴)

''وہ اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے کلمات سے حق کر دیتا ہے۔ وہ سینوں کے چھپے راز جانتا ہے۔''

اس آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائے داری نہیں بخشتا اور آخر کار حق کو حق کر دکھاتا ہے۔ لہٰذا اے نبی، تم ان کے جھوٹے الزامات کی ذرہ برابر پروا نہ کرو ایک وقت آئے گا جب کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اڑ جائے گا اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو، اس کا حق ہونا عیاں ہو کر رہے گا۔

اللہ نے اس کلمہ کو فی ذاتہٖ رفعت بخشی تھی اور اس کی تقدیر یہی بنائی تھی کہ وہ سر بلند ہو کر رہے (وَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا) یہ اس لیے تھا کہ یہ کلمہ حق وصداقت اور عدالت کی تکمیل سے عبارت تھا اور ہے:

وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (الانعام:۱۱۵)

''تمھارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔ کوئی اس کے کلمات (فرامین) کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔''

اس کلمہ کی اشاعت اور اس کی سر بلندی کے لیے رسول اللہ ﷺ مامور کیے گئے تھے، اس کلمہ کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علم اور حکمت کو آپ کے ہم رکاب بنایا تھا۔ عقل و دانش کے بیش بہا خزانے عطا فرمائے تھے۔ یہ اللہ کا ذکر تھا اور ہے، مگر یہ انوکھا ذکر تھا، جس کا انداز اور جس کی خاصیت بہترین حکمت سے معمور تھی۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ○ (یونس:۱)

''ال ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں، جو حکمت اور دانش سے لبریز ہے۔''

رسول اللہ ؐکی یہ صفت نمایاں کی گئی کہ آپ صرف تزکیہ کرنے پر مامور نہیں کیے گئے ہیں بلکہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بلکہ زیادہ درست انداز اظہار یہ ہے کہ آپ ایسا تزکیہ کرنے پر مامور کیے گئے تھے، جو علم وحکمت سے عبارت ہے۔

آپ کا فریضہ اللہ کا ذکر تھا۔ آپ کی زبان مبارک خود بھی ذکر سے سرشار رہتی تھی اور آپ تمام انسانوں کو اس ذکر کی طرف بلاتے تھے۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ (ق:٤٥)

''پس اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرو، جو میری تنبیہ سے ڈرے۔''

قرآن کریم، دعوت غور وفکر دیتا ہے اور ذکرِ الٰہی کی طرف سمجھ رکھنے والوں کو ترغیب دیتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (ص:٢٩)

''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے، جو اے محمدؐ ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

اس کلمہ کی اشاعت کی اوّلین ذمے داری انسان کی قوت گویائی پر ڈالی گئی ہے۔ قرآن کریم انسان کی قوت گویائی کی غایت کی طرف نہایت بلیغ اشارے کرتا ہے۔ کبھی وہ فرماتا ہے کہ یہ قوت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے، اس کا احسان ہے، اس لیے دینے والے کی شکر گزاری اس کا فطری تقاضا ہے:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمٰن:٤)

''اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔''

دوسری جگہ اپنے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے قدرت تحریر (القلم) کو اپنا فضل قرار دیتا ہے:

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق:٣-٥)

''اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم سکھایا، جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

قرآن کریم نے اس کلمے کی تفہیم وتشریح اور اس کی دل نشینی کے لیے بہترین رہ نمائی کی ہے، اس نے اس غرض کے لیے مختلف مواقع پر دل نشین انداز بیان اختیار کیے ہیں۔ کہیں ایجاز سے کام لیا ہے، کہیں تفصیل سے، جہاں ضرورت سمجھی، وہاں انذار کا طریقہ اپنایا اور کہیں تبشیر کا۔ بات کو واضح کرنے کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّکَّرُوْا وَ مَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (بنی اسرائیل:۴۱)

''ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں مگر وہ حق سے اور دور ہی بھاگتے جا رہے ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ (یونس:۵)

''وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے، جو علم رکھتے ہیں۔''

اس مقصد کے لیے اس نے ''احسن القصص'' بھی منتخب کیے تا کہ نصیحت کا حق ادا ہو جائے:

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (یوسف:۱۱۱)

''اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں، انھیں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کلمہ کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے قرآن کی سکھائی ہوئی تدبیر پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصاحت اور بلاغت کلام کی ایسی قدرت عطا فرمائی تھی، جس سے بالاتر صرف قرآن کا حسن کلام تھا، جس کے سامنے عرب کی قدرت کلام ماند پڑ جاتی تھی۔ جو سنگلاخ زمینوں میں گداز پیدا کر دیتا تھا اور اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دیتا تھا۔ علم و حکمت کے ایسے موتی آپ نے اپنی زبان اعجاز سے لٹائے تھے کہ خود علم و حکمت انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ آپ کی زبان سے کبھی بھونڈے الفاظ ادا نہ ہوئے۔ آپ نے قرآن کی تعلیمات کو ہر شخص

کے مزاج اور حالات کے مطابق اس طرح چسپاں کیا کہ اس نے ان کو اپنے دل کی آواز سمجھا۔ آپ نے صرف اجتماعی کمزوریوں کی نشان دہی نہیں کی بلکہ انفرادی خامیوں اور مسائل کا حل بھی بتایا۔ جھوٹ کی جگہ صداقت، ظلم کی جگہ عدل واحسان، خودغرضی کی جگہ ایثار اور بے نفسی، عصبیت اور حمیت جاہلیت کی جگہ عام انسانوں سے مواخاۃ کے چراغ روشن کیے۔ طلب معاش کو عبادت قرار دیا، جنسی خواہشات کی تکمیل کو حدود اللہ کی پابندی کے زیر سایہ، صدقہ کا مقام عطا کر دیا۔ سیاست کے گھناؤنے عمل کو فریضہ خلافت کی انجام دہی بتا کر حکمرانی کو زہد پر فضیلت بخشی۔

کبھی اس کلمہ کی تفصیل بیان کی، کبھی جامع اور مختصر الفاظ استعمال کیے، کبھی کہانی سے کام لیا۔ کبھی ضرب الامثال بیان کیے، کبھی احکام الٰہی کے کسی ایک جزو پر عمل کی تاکید کی اور کبھی دوسرے جزو کی تعمیل کو مدار صالحیت بتایا۔ آپ کی خداداد حکمت نے فرد اور سماج کے دکھوں پر نبض رکھنے کی استعداد عطا کی۔ عرب سماج کا سب سے بڑا مرض قبائل کی دشمنی تھی۔ آپ نے سب کو شیر وشکر بنا دیا:

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا
(آل عمران: ۱۰۳)

”تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

انسانی جان سستی تھی، قتل اور غارت گری ان کا شیوہ تھا۔ آپؐ نے خدائی فرمان کے تحت قتل کو حرام قرار دیا۔ انصاف اور عدل ناپید تھے، آپ نے عدل کا کلمہ بلند فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ کی نصیحت فرمائی۔ اس طرح محض ایک کلمے کے ذریعے سماج کو عدل و انصاف کا گہوارہ بنا دیا۔ پاکیزگی اور عفت کو اس کا چلن بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی کہ ہر حال میں قول سدید اختیار کرو (الاحزاب: ۷۰) اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر واضح کیا کہ طاغوت پسند اور شر وفساد پر عامل لوگوں کی خرافات اور پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہو۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا. (یونس: ۶۵)

''اے نبی! جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں، وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے۔''

دور حاضر میں قوت گویائی اور استعداد تحریر نے دنیا پر غلبہ حاصل کرلیا ہے، جھوٹ اور دروغ بیانی نے ٹکنالوجی کے سہارے اسلام اور امت مسلمہ پر جو یورش کر رکھی ہے، اس کا انسداد صرف قول سدید اور کلمۂ عدل و احسان سے ہی ممکن ہے۔ یہی محاذ ہے، جس پر باطل نے ہمیشہ شکست کھائی ہے اور آج بھی ہزیمت اور پسپائی اختیار کرے گا۔ حریف طاقتوں کی عسکری محاذ آرائی کا انسداد صرف کلمۂ حق سے ہی ممکن ہے، اس لیے کہ کلمۂ حق، مستحکم ہے، اس کی جڑیں انسانی قلوب کی سرزمین میں گہری اتر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات میں ایسی اثر انگیزی ہے کہ وہ دلوں پر لرزہ طاری کرسکتی ہیں۔ آج قلم اور زبان کے زور سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام، تشدد کا معلم ہے، وہ جمہوریت کا حریف ہے، عورت کو قید و بند کا پابند کرتا ہے، وہ ماضی پرست ہے، سائنس کا دشمن ہے، وہ اوہام اور خرافات کا پیروکار ہے، ہر مختلف نقطۂ نظر اور عقیدے سے ہمہ وقت نبرد آزما رہتا ہے۔ مگر ان سب افترا پردازیوں کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان تمام محاذوں پر اسلام کے پیغمبر ﷺ نے باطل کو فرار پر مجبور کیا ہے اور آج بھی مجبور کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس کا کلمہ مستحکم اور عدل و صداقت کا علمبردار ہے، انسانیت کے ہر دکھ کا مداوا ہے۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کو دور حاضر میں، جس حریف کا سامنا ہے، وہ آلات حرب سے بہرور ہے، دولت اور وسائل دولت سے مالا مال ہے، جب کہ اسلام اور اس کے پیروکار جدید آلات حرب سے محروم ہیں اور دولت کے لحاظ سے مفلس ہیں۔ اس لیے ان دونوں محاذوں پر اپنی جدوجہد کو مرکوز کردینا چاہیے۔ ایسے لوگ انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد سے ناواقف ہیں یا واقف ہیں لیکن اس کو اب داستانِ ماضی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے جبروت کے بالمقابل صرف کلمۂ حق کا سہارا لیا تھا اور نبی کریم ﷺ نے زبان صداقت کے ذریعے ہی قریش کے جبروت کا خاتمہ کیا تھا۔

کلمۂ حق کو اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت تائید حاصل رہتی ہے اور اس کی قوت تاثیر کے سامنے بڑے بڑے اسکندر، دارا و فرعون وقت خود کو بے دست پاتے رہے ہیں۔ اس لیے دور حاضر میں

اس قوت کے استعمال کو اوّلین ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے غالباً یہ مقدر کر دیا ہے کہ مستقبل میں اسلام کی لڑائی قلم کی لڑائی ہوگی، ابلاغ اور اشاعت کی لڑائی ہوگی، اور اس کے ساتھ علم وحکمت کی لڑائی ہوگی۔ ایسا علم اور ایسی حکمت، جس کی شعاعیں اللہ کے نور سے مستنیر ہوں گی۔ اس وقت ضرورت ہے کہ لسان وقلم کی لڑائی کی ہمہ جہتی تیاری کی جائے۔ ہر گوشۂ ظلمت کو منور کیا جائے، جہل عنکبوت کے ہر جالے کو توڑ دیا جائے، گمراہی اور شر کے ہر حربے کو علمی میدان میں شکست دی جائے۔ یہ علم سراسر صداقت ہے، اس لیے دور حاضر کے جہل بنام علم کو چیلنج کر سکتا ہے۔ اس مستحکم علم نے جہل کو ماضی میں شکست دی ہے اور یہی دور حاضر میں بھی شکست دے گا۔ ان شاء اللہ! قلم کی طاقت، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس نعمت کو اللہ کے دین کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس کی بلیغ دعوت، اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں دی ہے، اس لیے قلم، اسلام کی جدید لڑائی کا اہم ہتھیار ہونا چاہیے۔ قلم صداقت شعار، قلمِ عدل گستر، قلم ماحی بجہل و خرافات، قلم جو سراسر نور ہو، جو آیات اللہ کو واضح کرتا ہو، جو آنکھوں کو بصیرت عطا کرے، جو بے خوف ہو، قلم کو فرعون اور نمرود نہ کاٹ سکے، دور حاضر کے فرعون کی اتنی مجال کہاں؟

ایک بصیرت افروز حکایتِ عزیمت

اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی اس وقت جس طرح نشانوں پر ہیں، اس میں اور انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی ابتدا کے حالات میں ایسی مماثلت ہے کہ اپنے حریفوں کی تیراندازی سے زیادہ اپنے قائدین کی یاد آتی ہے، جو عزم اور حوصلہ کے ناقابل تسخیر پہاڑ تھے، جنھوں نے اپنے سینے حریفوں کے ہر وار کے لیے کھول دیے تھے۔ تاکہ ملت اسلامیہ کے عقیدے اور عمل کو ضرب نہ پہنچے۔ وہ خود بھی دین حق کے والہ وشیدا تھے مگر اپنے دل کی تڑپ اور کسک کو لاکھوں انسانوں تک عام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ وہ طاغوت کی خوش نمائی کا پردہ چاک کرسکیں اور اس کے گھناؤنے کردار کو واشگاف کرسکیں۔ وہ حسن حق کے اسیر تھے اور ہر شخص کو جو ان کے حلقۂ اثر میں آتا تھا اسی حسن کے سحر میں مبتلا کردیتے تھے۔ ان قائدین کی جدوجہد نے حریفوں کو دہشت زدہ کردیا، جوانوں کی زندگیاں بدل دیں، عقائد کو تازگی اور استحکام عطا کیا۔ بے بسی اور خود شکستگی کو یقین اور حوصلہ سے بدل دیا۔ اسلام کو رسم ورواج سے اوپر اٹھا کر تحریک استقلال کا مرتبہ عطا کردیا، جو اس دین کی متاع گم گشتہ تھی۔ ان قائدین نے ایک کہکشاں بنائی تھی، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، حسن البنا شہیدؒ، سید قطبؒ، سید ابوالحسن علی ندویؒ، عبدالقادر عودہؒ اور جانے کتنے ستارے اس کہکشاں میں گردش کر رہے تھے، ان میں سے جس کسی کی زندگی کے اوراق پلٹیے آبِ حیات اُمڈتا نظر آئے گا۔ اس وقت ان تمام قائدین کا اجمالی ذکر بھی ممکن نہیں ہے۔ صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے ہم صرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ذکر کریں گے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اس وقت ملت اسلامیہ کا حال یہ ہے کہ چہار طرفہ حملہ کے سامنے عوام اور خواص دونوں ہراساں ہیں۔ اس یورش کو بڑھانے میں ذرائع ابلاغ کا اہم رول ہے، گزشتہ صدی میں میڈیا کی رسائی محدود تھی، اس لیے عامۃ المسلمین کا ایک بڑا حصہ اس سے محفوظ رہتا تھا۔ مگر اب جس نسبت سے میڈیا کی رسائی بڑھی ہے، اس نسبت سے اس کی شدت اور اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک اسلام کے عقیدے، اس کی اخلاقی اقدار اور اس کی تہذیب پر جب ضرب لگائی گئی تو عوام سے زیادہ ان کے خواص (علماء اور دانشور) متاثر ہوئے، افکار اور آرا کی اک لہر اٹھ پڑی کہ اسلامی تہذیب اور ثقافت اب داستانِ پارینہ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا مغربی تہذیب اختیار کرنا چاہیے۔ مصر کے عربی ادب اور ہندستان کے اردو ادب میں افسانے اور ناول ایسے لکھے جانے لگے، جن میں بعض براہِ راست اور بعض بالواسطہ اسلامی تہذیب سے احتراز کو عین ترقی قرار دیتے تھے۔ ہندستان میں پہلے تو ''شریف زادہ''، ''امراؤ جان ادا'' اور توبۃ النصوح'' جیسی کتابیں عام ہوئیں، جو معتدل انداز سے فرنگی تہذیب کی ترغیب دیتی تھیں۔ اس کے بعد ترقی پسندی کے نام سے بے حیائی اور فحش گوئی تک نوبت پہنچی۔

ادب اور ثقافت کے یہ مظاہر اگرچہ اخلاقی اقدار کو متاثر کرتے ہیں مگر بہ راہِ راست عقیدے پر اثر نہیں ڈالتے، اس لیے اسلام کے عقائد پر زیادہ کارگر اثر ڈالنے والی سنجیدہ تحقیق اور اشاعتی لٹریچر کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے چند مہمات امور کو منتخب کیا گیا۔ سب سے پہلے مسئلہ اسلام کی تعلیم جہاد تھی، جس کے متعلق یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔'' دوسرے، عورت کی مفروضہ بے بسی اور تاحیات قید و بند کو اسلام کا شعار قرار دیا گیا۔ یہ پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا کہ غیر مسلم کے علاوہ، مسلمان تعلیم یافتہ خاندان بھی اس کے قائل ہو گئے۔ تیسرا ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذات بنائی گئی۔ آپ کی ازدواجی زندگی پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ ہندستان میں ''رنگیلا رسول'' جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ چوتھا نشانہ حدیث رسول ﷺ کو بنایا گیا، اور ان کی صداقت اور اعتبار پر شک و تردد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور

ہندستان میں منکرین حدیث کا فتنہ نمودار ہوا۔ اس طرح نہایت ہوشیاری سے دین حق کی بنیاد کھوکھلی کی جانے لگی۔

اسی دور میں مارکسزم نے نفس مذہب کو عوام کے لیے ''افیون'' قرار دینے کی کوشش کی۔ دوسرے مذاہب کا اس الزام سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے کبھی اجتماعی مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ لیکن اسلام نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل ہے۔ اس دور میں فاشزم اور اشتراکیت نے اول تو یہ دعویٰ کیا کہ انسان کا حقیقی مسئلہ روٹی، کپڑا اور مکان ہے۔ ثانیاً اس حل کے میدان کے صرف دو دعوے دار رہ گئے: فاشزم اور اشتراکیت۔ حالات نے اشتراکیت کو اس میدان میں کامیابی عطا کی۔ لیکن اسلام اس لڑائی میں کنارے لگ گیا۔ ہمارے علما اور دانشور بھی یہی سمجھنے لگے کہ معاش کا حل اسلام نہیں بلکہ اشتراکیت یا سرمایہ داری کے ہاتھوں ہی ممکن ہے۔ کتنے ہی صاحبانِ علم و دانش نے دعویٰ کر دیا کہ اشتراکیت عین اسلام ہے۔ اگر چہ معاشی مسئلہ، زندگی کا ایک پہلو ہے لیکن اس سے بے دخل کیے جانے کے معنی یہ تھے کہ زندگی کی تعمیر اور تشکیل سے بھی بس مذہب کا عمل دخل ختم ہو جائے اور وہ صرف چند اخلاقی قدروں اور روحانی مراتب تک محدود رہے۔ اس لیے اسلام کا بھی نہ سیاست سے تعلق ہے اور نہ ہی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے۔ اشتراکیت نے یہ سبق دیا تھا کہ اخلاقیات کو دائمی حیثیت دینا صحیح نہیں بلکہ وہ تو صنعتی روابط کے ماتحت بنتے اور بگڑتے ہیں۔ سیاست، ادب، تہذیب، انسانی روابط سب پیداواری روابط (Relation of Productoin) سے ماخوذ ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفے کے اختیار کرنے سے اسلام کا نظام اخلاق ہی منہدم ہو جاتا ہے، جو کہ اخلاقی اقدار کو دوامی حیثیت عطا کرتا ہے۔

اس زمانے میں دین اسلام محض مراسم اور عبادت کا مجموعہ بن گیا تھا، جس کی زندگی اقتدار وقت کے رحم و کرم کی مرہون منت تھی۔ جس گوشۂ عافیت میں اسے جگہ مل جائے اسی پر اکتفا کرنا عوام اور خواص دونوں نے سیکھ لیا تھا۔ ان تمام حالات کو دو آتشہ کرنے والا ملت اسلامیہ کا اپنے منصب کا عدم شعور تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ شہادت حق اس کا فریضہ ہے اور دین کی اقامت

اس کا نصب العین ہے۔ اسے ہندوستانی سیاست نے محض قوم پرستانہ لڑائی کرنا سکھائی تھی اور وہ انھیں اصطلاحات سے واقف تھی، جن کا چلن تھا۔

اس پورے تناظر میں حریفوں سے کہیں زیادہ نقصان دہ اپنوں کا کردار ثابت ہو رہا تھا۔ ہمارے علماء گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے تھے، انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر فتنہ وفساد ہمہ گیر ہو جائیں تو اپنے ایمان کی سلامتی کی خیر مناتے رہو۔ علماء ہند کا جو مکتبِ فکر سرگرم کار تھا وہ قائد نہیں تھا بلکہ جدید اصطلاحات کا اسیر تھا۔ ان کے صاحبانِ علم ودانش نے یہ سبق سکھایا کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔'' نیاز فتح پوری جیسے صاحبِ طرز ادیب پیدا ہو گئے تھے، علامہ مشرقی جیسے خاکسار جلوہ گر ہونے لگے۔ یہ نعرہ بھی لگایا کہ ''تسخیر عالم'' جو قوم کرے گی وہی کامیاب اور کامران ہوگی۔ جیسا کہ (نعوذ باللہ) قرآن میں مذکور ہے اور جیسا کہ مغرب کے ہمہ گیر غلبہ سے ثابت ہو رہا ہے۔ جہاد کی تعلیم کو بعض ستم ظریفوں نے منسوخ قرار دیا اور جنھوں نے اتنی رعایت برتی کہ اسے منسوخ نہ کیا جائے انھوں نے کہا کہ یہ صرف دفاعی عمل ہے۔ مصر اور ہندستان میں ایسے علماء پیدا ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں، جنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن نے سود نہیں بلکہ اَلرِّبٰو کو حرام قرار دیا ہے۔

دورِ حاضر ماضی کے دور سے بڑی مشابہت رکھتا ہے، بلکہ متعدد پہلوؤں سے اس سے نازک تر اور زیادہ سنگین ہے۔ اس لیے کہ اِس دور میں بے بسی، انتشارِ فکری، ذہنی ژولیدگی ملت اسلامیہ کی عام صفت بنتی جارہی ہے۔ ایک طرف چیلنج کی سنگینی ہے، اس کی چہار طرفہ یورش ہے۔ دوسری طرف ہمارا طرزِ عمل ہے۔ ہمارے علماء کی تہی دامنی ہے، ہمارے دانشوروں کی ذہنی مرعوبیت ہے، ہمارے نوجوانوں کی بے سمتی ہے، ہماری عمومی بے بصیرتی ہے، مگر عالم اسلام ایسے صاحبانِ علم ودانش اور فقیہانِ عزم وحوصلہ سے خالی ہے، جو طاغوت کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس دور میں، جو خدمات انجام دی تھیں ان کا اجمالی ذکر بھی حیرت واستعجاب کا باعث بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مردِ حق آگاہ سے کیسی کیسی خدمت لے لی۔ انھوں نے اور ان کی صف کے دوسرے قائدین (حسن البنا، سید قطب وغیرہم) نے سب سے پہلے ملت اسلامیہ کو یہ شعور عطا کیا کہ اس ملت کو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ایک نصب العین عطا

کیا ہے، جس کے لیے جدو جہد اس کا فریضہ ہے۔ اس طرح انھوں نے رسم ورواج اور مراسم عبودیت سے محصور امت کو حرکت عمل سے روشناس کیا۔ اس جو ہڑ کو دریا کی روانی میں بدلنے کی کوشش انجام دی۔ اس کو یہ پیغام دیا کہ یہ ملت دوسروں کے طرزِ عمل سے چلنے کا گر نہیں سیکھتی۔ بلکہ خود زندگی کی شمع جلاتی ہے، قیادت کرتی ہے۔ پیچھے پیچھے دوڑتی نہیں۔ بنابریں ملت اسلامیہ ماضی کا عجوبہ نہیں ہے۔ جسے عجائب گھر میں اس کی مناسب جگہ رکھ دیا جائے۔ اس کا کام اس دنیا کو سجانا، بنانا، سنوارنا اور اس کے لیے ہمہ تن جدو جہد اس کا منصب ہے۔ اس مقصد کے لیے موصوف نے خطباتِ جمعہ مرتب کیا۔ سلامتی کا راستہ جیسی سادہ اور پراثر کتاب لکھی۔ سادہ الفاظ میں شہادت حق جیسی تصنیف لکھی اور متعدد موضوعات کے ضمن میں اس شعور کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ 'تجدید و احیائے دین' جیسی اعلیٰ معیار کی تصنیف اسی میدان کی ایک فاضلانہ کوشش ہے۔ سید مودودیؒ نے اسلام کی جامعیت کو واضح کرنے کی بے نظیر کوشش کی۔ مسلمانوں کو یہ بتایا کہ تمھارا دین صرف روحانی وظائف کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دنیوی زندگی کے اصول بھی دیتا ہے۔ وہ سیاست، معیشت، تہذیب وثقافت، انفرادی اور اجتماعی تعلقات، ازدواجی زندگی کے آداب، نظام حقوق وفرائض، سب کے متعلق ہدایات دیتا ہے۔ ایسی ہدایت، جس سے انسانی زندگی سنور جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں آپ نے اس اعتماد اور استدلال کے ساتھ پیش کیں کہ ملت کا یقین اور اعتماد بحال ہوتا گیا اور یہ حوصلہ پیدا ہوگیا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس جدوجہد کے لیے پیدا کیا ہے، جس میں انسانیت عامہ کی فلاح ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل کی کھیتیاں لہلہانے لگیں، خوابیدہ عزائم بیدار ہو گئے، اشتراکیت اور سرمایہ داری کے دعوے کھوکھلے نظر آنے لگے۔

آج ان کی کتنی یاد آتی ہے! ہماری شتر گربگی، ہمارے مفکرین اور دانشوروں کا مستعار طرزِ استدلال اور ہمارے علماء کی تہی دامنی نے ہمارے حالات کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ سید مودودیؒ کا کارنامہ اسلام کی جامعیت پر تقریر کرنے تک محدود نہ تھا بلکہ انھوں نے زندگی کے تمام اہم امور سے متعلق اسلام کی تعلیمات واضح کیں۔ تعلیمات کے اسلامی اصول واضح کیے اور بات یہاں تک پہنچا دی کہ دور حاضر میں اسلام کی ذہن سازی کا بڑی حد تک انحصار جدید علوم کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر نو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان کی دوررَس نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ علمی غیر جانب داری

(Scientific Objectiveity) کے پردے میں تہذیب فرنگ کی اقدار جلوہ گر ہیں، انھیں کھرچ کر پھینکنا ہوگا۔ لہٰذا اسلامی معاشرتی علوم کی تحریک برپا کی گئی، جس میں اسلامی اقتصادیات سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سید مودودیؒ نے کمیونزم کے اس فلسفے پر کاری ضرب لگائی کہ کسب رزق، زندگی کا محور ہے۔ انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کے لیے ایک مختصر کتاب میں اسلام کے پیش کردہ حل کے خدوخال واضح کیے۔ افسوس ہے کہ غیر تکنیکی ہونے کی وجہ سے اس کتاب پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ مگر یہ کتاب صاحب تصنیف کی حیرت انگیز بصیرت کی شاہد ہے۔ مسئلۂ سود پر ایک کتاب لکھ کر اس کی شناعت اور اس پر مبنی ظلم واستحصال کے نظام پر ایسی گرفت کی ہے کہ اسلامی اقتصادیات کے ماہرین کے ہزاروں صفحات پر یہ مختصر کتاب بھاری ہے۔

اسلام کے معاشرتی نظام اور خواتین کے حقوق و فرائض پر حقوق الزوجین جیسی تصنیف لکھ کر مغربی تہذیب کے اس خطرناک تصور پر ضرب لگائی، جو ازدواجی تعلقات میں صرف (Rights) حقوق پر زور دیتا ہے۔ 'پردہ' تصنیف کر کے اس تعلیم کو معاشرے کے لیے رحمت ثابت کیا۔ فرنگی عینک سے دیکھنے والوں کو وہ خباثتیں نظر نہیں آتیں، جو مغرب کے طرزِ زندگی کا لازمہ ہیں، جس میں گلیمر ضرور ہے لیکن عورت بازارِ جنس کا کھلونا ہے۔ عورت گھر کی چہار دیواری سے نکل کر ہر جنسی عقاب کا شکار ہے، مگر مرد کی ہوس ہے کہ سیر نہیں ہوتی۔ آزادی کے پچاس برس گزرنے کے بعد عورت کہاں پہنچی ہے اور کہاں پہنچے گی۔ جب یہ کتاب لکھی گئی تھی تو مصر و شام تو 'حجاب' کو تار تار کر چکے تھے، لیکن ہندستان میں مسلم معاشرہ میں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس پر شرماتی تھی۔ پردہ کو بابانگ دہل پسماندگی کی علامت قرار دینے والوں کے حملے سے دین دار طبقہ تلملاتا ضرور تھا لیکن دفاع نہ کر سکتا تھا۔ اس کتاب نے دلائل کے ذریعے دین داروں کو اپنے موقف پر جمنے کا حوصلہ دیا اور تذبذب میں مبتلا افراد کو یقین فراہم کیا۔ آج پردہ کے خلاف اس وسوسہ اندازی کی تجدید ہو رہی ہے، اگر سید مودودیؒ کی یاد نہ آئے تو پھر کیا ہو۔

اس مردِ حق آگاہ نے اسلامی سیاست کے میدان میں 'اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے' جیسی مختصر تصنیف لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اسلامی حکومت درحقیقت دعوت اور اجتماعیت کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ لیکن 'خلافت وملوکیت' لکھ کر موصوف نے ایک طرف اسلام کی

سیاسی تاریخ پر پڑے خس وخاشاک کو دور کیا اور خلافت کے اسلامی تصور اور موقف کو مبرہن کیا۔ یہ اپنے موضوع پر نہایت فاضلانہ اور دقیق تبصرہ ہے، جس نے 'امیر المومنین' اور 'جلالۃ الملک' کے انتشار فکر کو دور کیا اور یہ بتا کر کہ ملت اسلامیہ نے اس میدان میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے بالواسطہ یہ دعوت دی کہ احیائے خلافت اس کی ذمے داری ہے۔ آج بھی یہ کتاب عالمی ملت اسلامیہ کے لیے دلیل روشن ہے۔ آج تحریکِ اسلامی کے سیاسی موقف کے نقص اور اس کی ناکامی پر جب میں ایسی کتابیں دیکھتا ہوں کہ "The Failure of Political Islam" تو مجھے بے ساختہ سید مودودیؒ کی یہ کتاب یاد آتی ہے۔

سید مودودیؒ کا یہ کارنامہ صرف کتابوں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ انھوں نے ایک دینی اجتماعیت میں انتخاب اور شورائیت کا نظام قائم کر کے عصر حاضر میں ایک انقلابی قدم اٹھایا۔ ایک عرصے سے ملت اسلامیہ کے سیاسی نظام میں انتخاب کے بجائے ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ لیکن دینی نظام اجتماعیت میں تو موروثی خلافت تھی۔ وہاں تو پیر کے انتقال کے بعد صرف اس کا خاندان ولایت کا وارث بنتا تھا، جہاں نظام پیری ومریدی نہ تھا وہاں بھی شورائیت یا انتخاب بدعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر سید مودودیؒ نے ایک خالص دینی نظام اجتماعیت میں انتخاب امیر اور شورائیت جاری کر کے معرکۃ الآرا قدم اٹھایا۔ بعض دین دار لوگ اس پر ناک بھوں سکیڑتے رہے لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنے دور رَس اثرات کے لحاظ سے یہ قدم کتنا اہم تھا، اور ہے! اگر آپ اس پہلو سے غور کریں کہ اجتماعیت کے اس طریقہ کو قائم کر کے سید مودودیؒ نے اسلام کی اس تعلیم کو نافذ کرنے کی کوشش کی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ موثر طریقے پر صرف اجتماعی شکل میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ انفرادی کوششیں صرف ایک محدود دائرہ میں سکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ اجتماعی تحریک دعوت کا دائرہ عمل وسیع ہوتا ہے، وہ نسبتاً وسیع ذرائع اور وسائل فراہم کر سکتی ہے، چیلنج کا بہتر مقابلہ کر سکتی ہے، ایسی تحریک کا نظام اور قیام صرف اسلام کے نظام انتخاب اور شورائیت کے واسطے سے ممکن ہے، چناں چہ جماعت اسلامی انھی بنیادوں پر قائم کی گئی اور الحمدللہ آج بھی رواں دواں ہے۔

سید مودودیؒ نے اپنی علمی اور دعوتی کوششوں کو صرف خارجی یلغار تک محدود نہیں رکھا

بلکہ اس گرد وغبار کو بھی صاف کرنے کی کوشش کی، جو تاریخ کے لمبے سفر کے دوران ملت اسلامیہ نے خود ہی اختیار کر لیے تھے۔ آپ نے اپنی مختلف کاوشوں کے ذریعے تصوف کے غیر اسلامی عناصر پر برمحل تنقید کی۔ گوشہ گیری اور رہبانیت پر قرآنی گرفت کو واضح کیا۔ مولانا مرحوم نے قومی تہذیب اور ثقافت کو اسلامی اجزا سے الگ کیا اور یہ واضح کیا کہ ملت اسلامیہ کی متاعِ عزیز اسلامی اقدار اور اصول ہیں، تہذیب مظاہر نہیں۔ اس سلسلہ کی اہم ترین تصنیف 'اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر' ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتاب کی قدر و قیمت دین دار گروہ کی اکثریت نہ سمجھ سکی۔ حالاں کہ اس نے اسلامی عبادات کو پوجا پاٹ کے روایتی تصور سے بہت بلند مرتبہ پر فائز کر کے اس کو تابندہ اور حرکی بندگی تک پہنچانے کی مبارک کوششیں کی تھی۔ الفاظ کے الٹ پھیر میں پھنسنے والے اور روحانیت کے گھروندوں میں پرورش پانے والوں کو یہ کوشش بالکل پسند نہ آئی۔

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر کے بالمقابل آپ کی تصنیف 'الجہاد فی الاسلام' رکھی جا سکتی ہے۔ اگر چہ 'الجہاد فی الاسلام' حریفوں کے اعتراضات کا جواب دینے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ مگر اپنی جامعیت کے اعتبار سے یہ جہاد کی ہر پہلو سے مؤثر اور بامعنی تشریح پر مبنی ہے۔ اس میں عدم تشدد کے فلسفہ کو غیر عملی اور خیالی بتایا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ اہنسا اور عدم تشدد کی تعلیم یا تو ان مذاہب کی تعلیم ہے، جن کا زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ یا پھر حکمرانوں کی ساحری کے کھیل ہیں۔ جو لوگ آج اسلام پر خوں آشامی کا الزام لگاتے ہیں ان کے دامن خون میں لت پت ہیں۔ دہشت گردی، مظلوم عوام کی بے بسی کا اظہار ہے، اور امریکہ اور اسرائیل جیسی جابر اور ظالم حکومتوں کا شعبدہ! آج سید مودودیؒ کی یاد آتی ہے کہ اگر ان کا قلم ان کی بصیرت، ان کا یقین ہمیں بھی حاصل ہو سکتا تو ہمارے صغیر و کبیر صرف معذرت خواہی پر اکتفا نہ کرتے کہ اسلام کا دہشت گردی سے سروکار نہیں اور کچھ لوگ یہ ثابت نہ کرتے کہ دور حاضر میں جہاد (قتال) خارج از امکان ہے۔ بلکہ الزام تراشوں کو آئینہ دکھاتے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ کیا جہاد کی پوری اسلامی تاریخ میں اتنی ہلاکت اور بربادی ہوئی تھی جتنی تم نے عراق میں کر ڈالی۔ اس کتاب میں پہلی بار اسلام کے قوانین جنگ یک جا کر دیے گئے ہیں، جو اس عمل کو مہذب و منضبط اور انسانیت کا خیر خواہ بتاتے ہیں، جو آج کے قوانین سے بالاتر ہیں۔

سید مودودیؒ- اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، بہر حال انسان تھے۔ ان میں بھی خامیاں تھیں۔ ہر انسان کی طرح وہ بھی اپنے زمانے کے حالات اور افکار سے متاثر ہو سکتے تھے۔ نفیاً اور اثباتاً بھی۔ الٰہی تعلیمات کی تعبیر اور ان کا انطباق، ہر انسان اپنی عقل اور بصیرت کے مطابق کرتا ہے، یہی مولانا مودودیؒ نے بھی کیا۔ یہ مقام صرف نبی کو حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت ہدایت اور روشنی میں کام آتا ہے، اس سے کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اس کا ہر لفظ لائق تقلید ہے، سید مودودیؒ کی کتنی باتیں ایسی ہیں، جن سے اختلاف کا حق حاصل ہے، کتنے مسائل ایسے ہیں، جن میں ان کا تجویز کردہ حل آج ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے، لیکن انھوں نے جو روشن راہ دکھائی تھی وہ ان کی خود ساختہ نہیں تھی۔ بلکہ ایمانی بصیرت سے اخذ کردہ تھی۔ آج کے حالات میں ہمیں اللہ سبحانہ سے ان کی جیسی دانش مندی، جامعیت، صبر اور عزیمت کی دعا کرنی چاہیے۔ سید مودودیؒ، سید قطبؒ، حسن البنا شہیدؒ واپس نہیں آ سکتے لیکن ان سب نے ہمیں جو راہ دکھائی تھی اس پر چلنے کا، ان کا عزم وحوصلہ اور بصیرت حاصل کرنا ہم سب کی تمنا ہونی چاہیے۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے صرف تحریر اور تقریر میں چہار طرفہ محاذ نہیں کھولا تھا بلکہ عملی دنیا میں حیرت انگیز مردان کار پیدا کیے۔ مفکر اور علماء تو بہت بڑی تعداد میں اُس وقت بھی تھے اور اِس وقت بھی ان کی کمی نہیں ہے۔ لیکن آپ کے علم کو اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر عطا فرمائی تھی، جو دلوں پر براہِ راست اثر کرتی تھی اور ایسی کاٹ بھی دی تھی، جو حریفوں کے اندرون میں پیوست ہو جاتی تھی۔ آپ کی شخصیت میں ایسی کشش تھی، استدلال میں حسن صداقت اور زور کلام کا ایسا موزوں امتزاج تھا کہ ہر میدان میں آپ کے ساتھی پیدا ہوتے گئے۔ اسکالر پیدا ہوئے، ماہرین معاشیات کا ایک بین الاقوامی سلسلہ وجود میں آیا۔ اسلامی فلسفہ اور عبادات کے ماہرین نے آپ سے جلا پائی۔ ادیب اور شاعر اسلامی اقدار کے ایسے ترجمان بنے کہ دنیا ان سے خوف کھانے لگی اور ہم آہنگ بھی بن گئی۔ اس کے علاوہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دینے والے میدان کار پیدا ہوئے، یہ سعادت اپنی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اللہ سبحانہ کا عطیہ تھی، جو آگ آپ کے اندرون میں جل رہی تھی، وہ اپنی جدت میں ہزار شعلوں سے بالاتر تھی، اس نے کتنوں کو لعل وجواہر میں بدل دیا۔ کتنے بزدلوں کو چیتے کے جگر دیے اور کتنے کم نظروں

کو شاہین کا تجسس دیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حدّت عشق سے ہمیں بھی آشنا کردے۔ یہ سلسلہ صرف ایک ملک کی سرحد تک محدود نہ رہا، بلکہ پورے عالم میں آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والے پیدا ہوگئے۔ جنھوں نے ہمہ جہتی جدوجہد جاری رکھی۔ ادب کا میدان ہو، یا معاشیات کا، فلسفہ کی جولانیاں ہوں یا سیاست کی آبلہ پائی، ہر میدان میں مودودیؒ کی پیدا کردہ سرگرمی آج بھی جاری ہے۔ آپ نے یہ تلقین کی تھی کہ اجتماعی زندگی ہر سمت سے اسلام کے زیرنگیں لانا، ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ الحمدللہ آج کتنے ہیں، جو اس جولان گاہ حق میں سرگرم کار ہیں۔ اس لیے کہ دورحاضر میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے سید مودودیؒ کو دی تھی کہ وہ اسلام اور اس کے نصب العین کے لیے اجتماعی جدوجہد کا داعیہ ملت اسلامیہ کے اندر پیدا کریں۔ یہ اتنی مہتم بالشان خدمت ہے کہ اس نے تاریخِ اسلام کا رُخ موڑ دیا ہے، ورنہ روایتی دین داری تو دین کے غلبہ کی جدوجہد کو بھی دنیاداری سمجھتی رہی اور اب بھی سمجھتی ہے۔

یہ ایک مختصر سی یادداشت ہے، سید مودودیؒ کے احسانات کی، ورنہ آپ کی جدوجہد کا ہر پہلو ایسا ہے کہ اس پر سیکڑوں صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔

وحدت کا سبق

اسلامی تحریکات کی دعوت کا ایک خوش گوار اور مہتم بالشان پہلو یہ تھا کہ امت اسلامیہ مسلکی اور گروہی اختلافات سے بالاتر ہوکر دین حق کو قائم کرے اور اس کے روح افزا پیغام کی شہادت کا فریضہ انجام دے۔ اس جدوجہد نے جب ثمر باری کا آغاز کیا تو ایران کے اسلامی انقلاب کے واسطے سے شیعہ اور سنی کے باہمی نزاعات کی لے مدھم پڑ گئی۔ ہمیں وہ دن یاد ہیں جب کہ قُم کی مسجد میں سنیوں کے ایک معتبر اور عالمی شہرت یافتہ عالم دین نے نماز باجماعت کی امامت کی تھی۔ سنی علما اور عوام نے اس انقلاب کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز تصور کیا تھا۔ تحریک اسلامی کے نامور علما اور دانشوروں نے بہ یک زبان ایرانی انقلاب کو دور حاضر کے ان تجزیہ نگاروں اور تاریخ دانوں کا مُسکت جواب قرار دیا تھا، جو اسلام کو ماضی کی داستان کے بطور پیش کرتے نہیں تھکتے تھے۔

گرچہ کہ ایران کا اسلامی انقلاب شیعی نقطۂ نظر پر مبنی تھا۔ لیکن ملت اسلامیہ نے اس فرقی ایڈیشن کو بھی شرع اسلامی کی بالادستی کا ہراول دستہ سمجھا۔ ملت اسلامیہ یہ سمجھنے لگی کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا یہ انقلاب ہراول دستہ ثابت ہوگا۔ پوری ملت اسلامیہ کی دیرینہ آرزوؤں کے پُر ہونے اور مسلکی اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کے امکانات روشن ہونے لگے۔ یہ دور وہ تھا جب کہ مردہ اور خائف دلوں میں جان پڑنے لگی تھی۔ اس دور میں لازم تھا کہ ہم یک زبان ہوکر اس انقلاب کی اسلامیت کی تائید

کرتے اور فروعات سے بلند ہوکر بنیادوں پر توجہ دیتے۔ ہر طرف یک جان دو قالب ہوکر دشمنانِ حق کو یہ پیغام دیتے کہ تمام فروعی اختلافات کے باجود شریعت اسلامیہ کی بالاتری اور اعلاء کلمۃ اللہ ہر مومن کے دل کی تڑپ ہے۔ یہی اُن کے قرآن کا پیغام تھا اور ہے۔ یہی اخوت ان کی حقیقی قوت تھی اور ہر نوع کی مادّی قوت سے کہیں زیادہ صلابت رکھتی ہے۔ انما المومنون اخوۃ ان کے دین کا حیات افزا پیغام تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ تم سب مل جل کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

وَ اَطِیْعُوْا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَـهٗ وَلاَ تنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال:۴۶)

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کم زوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

اَقِیْمُوا الدِّیْن

اس ملت کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سب مل کر اللہ کے دین کو قائم کرو۔ یہ وہ دین ہے، جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے جلیل القدر انبیاء حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ تک پر نازل فرمایا تھا اور یہ حکم دیا تھا کہ زمانے کے فرق کے باوجود دین میں تفریق نہ کرو اور اس کے دین کی اقامت کرو۔

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلاَ تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ط (الشوریٰ:۱۳)

''دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔''

اسلامی تحریکات نے یہی کوشش کی تھی کہ اس پیغام کی تجدید ہو جائے، اتفاق واتحاد کی وہی حیات بخش ہوائیں پھر چلنے لگیں۔ ایران کے انقلاب کو اس کی عملی تعبیر سمجھا گیا تھا۔ اعتصام بحبل اللہ کی دعوت کی طرف یہ رجعت تھی۔ اس دیرینہ ملت کے لیے از سر نو مسلکی اور فرقی اختلافات کو بھلانے کی طرف یہ مثبت پیش قدمی تھی۔ یہ دور تھا جب کہ ملت اسلامیہ کے

نوجوانوں اور بوڑھوں کی روح میں اس نے اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ اضطراب ہر طرف نظر آتا تھا۔ ایران ہو کہ عرب ممالک حتی کہ اس کی لہریں ہندستان، انڈونیشیا اور ملائیشیا تک پہنچ گئی تھیں۔

مگر یہ بات ہمارے حریفوں کو ایک آنکھ نہ بھائی، انھوں نے نہ ایرانی انقلاب کو پسند کیا اور نہ زیر زمین اتحاد اور یگانگت کے اس انقلاب کو، جسے اسلامی انقلاب کے سرچشمے سے سیراب کیا جاتا تھا۔ یہ اتفاق اور یگانگت فی نفسہٖ کسی تصادم اور آویزش کا پیش خیمہ تھا۔ یہ تو رسول اکرم ﷺ کے کردار کا پرتو تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین کا خطاب دیا تھا۔

ملت اسلامیہ: حریفوں کے نرغے میں

مگر یہ ملت بہت جلد حریفوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوگئی۔ تاریخ زیادہ لمبی نہیں ہے کہ شرق اوسط کے خودساختہ مغربی مفکرین نے شیعہ، سنی اختلافات کو نمایاں کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کتنے تجزیے اور تبصرے ایرانی انقلاب سے پہلے اور اس کے چند برسوں کے بعد ایسے آنے لگے، جنھوں نے شیعہ، سنی اختلافات کو مرکز توجہ بنا کر پیشین گوئی کا سلسلہ قائم کیا کہ یہ فرقی تنازعات اتنے گہرے ہیں کہ ایرانی اسلامی انقلاب کی عمر دراز نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد پہلی ضرب عراق کی سنی حکومت کے ذریعہ ایران پر عسکری حملے کرا کر لگائی گئی۔ یہ ۸، ۹ برس تک چلنے والی ایسی ضرب تھی، جس کے دوران کلمہ گو مومنین نے اپنے ہی دینی بھائیوں کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا۔ عرب کی سنی حکومتوں نے عراق کی سنی حکومت کی زبانی اور کسی حد تک عملی تائید کی۔ صدام حسین جو خود اپنے ملک میں شیعہ اکثریت کے لیے ظالم مقتدر تھا، مغرب کا چہیتا بن گیا کہ وہ اسلامی ایران کو کم زور کر دے گا۔ مگر قدرتِ الٰہی کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ مغرب کی اس پراکسی جنگ کا نتیجہ، ایران کے لیے کم لیکن خود صدام کے لیے مہلک نکلا، جو امریکہ کے عزائم کا شکار بن گیا۔

اب ہماری ملت کی حالت یہ ہے کہ وہ سبق جو اسلامی تحریکات کو زندہ کرنے کی جدوجہد سے ملا تھا یکسر بھلا دیا گیا اور اتفاق واتحاد کی فضا مسموم ہوگئی۔ عراق میں شیعہ اور سنی ایک دوسرے

کی جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ امریکہ کا تو وہ کچھ نہ بگاڑ سکے مگر آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے میں ماہر ہو گئے۔ مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں، مسجد میں نمازیوں پر حملہ کرنا ثواب کا کام سمجھا جانے لگا ہے۔

اس کے اثرات پاکستان کی مملکت پر پڑنے لگے۔ یہاں تک کہ مدح صحابہ کے دیوانے اللہ اور رسول کے نام پر عزا خواں شیعہ حضرات کو مساجد میں تہ تیغ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اور شیعہ حضرات بھی موقع پڑنے پر سنی بھائیوں کو تہ تیغ کرتے ہیں۔ انھیں نہ تو خدا اور رسول کا خوف ہے اور نہ جگ ہنسائی کا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں وعید سنائی تھی کہ:

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا○ (النساء: ۹۳)

''اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

اس قتل و غارت گری کے دوران مساجد کی بے حرمتی کے ساتھ قرآن کریم کو جلانے اور پھاڑنے کے کارنامے بھی انجام دیے جاتے ہیں۔ گویا قرآن صرف وہ لائق احترام ہے، جو خاص اس گروہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ قرآن جس کے متعلق ارشاد باری ہے:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ○ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ○ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ○ (الواقعہ: ۷۷-۷۹)

''یہ بلند پایہ قرآن ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔''

اللہ اللہ یہ وہ قرآن ہے، جس کو صرف پاک و صاف فرشتے اٹھاتے ہیں، جس کے احترام کے لیے مسلمان اپنی جان عزیز قربان کر دیتا ہے مگر جب وہ اپنے شیعہ بھائی کی

مسجد میں ہو تو سنی کے لیے اور سنی مساجد میں پایا جائے تو شیعہ کے لیے لائق عزت اور احترام نہیں رہ جاتا؟

یہ سب کچھ کس لیے کیا جا رہا ہے؟ اس لیے کہ بعض تاریخی واقعات ہمارے لیے دین حق سے زیادہ محترم بن گئے ہیں۔ یہ ملت خرافات میں کھو گئی ہے۔ اگر بعض تاریخی واقعات ہمارے دکھ کا باعث ہیں تو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ دونوں طرف اللہ کے متقی اور وفا شعار بندے تھے، انھوں نے اگر اجتہادی غلطی کی تو اس کی بنیاد پر ان کی ایمانیت سے انکار کرنا اور محض عزاداری سے انکار یا مدح صحابہ پر اصرار اتنا اہم تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمان بھائی کی جان کو سستا بنا لیا جائے اور ملت اسلامیہ اور دین حق کے تحفظ کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

ہمارے اختلافات

اس مرض سے ہندی مسلمان ادھر کچھ عرصے سے محفوظ تھا۔ اس لیے کہ ملت اسلامیہ ہند کو بہ حیثیت مجموعی اس امر کا شعور تھا کہ ہماری اصل طاقت اتحاد اور اتفاق ہے، اور یہ بھی کہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کا اصل ہدف دین حق کا تحفظ تھا اور ہے۔ مگر غضب کے ہیں ہمارے وہ حریف، جن کو مسلمان اور اسلام کا وجود ناگوار تھا۔ چناں چہ معمولی اور چھوٹے موٹے حادثات کے باوجود تمام مسالک اور تمام فرقے باہمی یگانگت کا لائق تقلید نمونہ پیش کرتے تھے، وائے بد نصیبی کہ ہمارے خلاف ریشہ دوانیوں نے اس میں شگاف ڈال دیے ہیں۔ چناں چہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے مدمقابل شیعہ اور بریلوی مسالک کے پرسنل لا بورڈ بن گئے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ ہمارے محترم قائدین نے جو مسلم پرسنل لا بورڈ کے سربراہ رہے ہیں کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں کی ہوں لیکن اس کے نتیجے میں بورڈ میں ایسے شگاف پیدا کرنا، جو ذرہ ذرہ کر کے جمع کی ہوئی اس جمعیت کو منتشر کر دے، محض کم نظری ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ خود نمائی

اور مفاد پرستی کے جذبات اس کے محرک رہے ہوں۔ لیکن یہ مسئلہ ہمارے سنجیدہ غور وفکر اور اصلاح احوال کا طالب ہے، نہ تو اس شگاف کو نظر انداز کرنا چاہیے اور نہ ہی یہ باور کرنا چاہیے کہ متبادل گروہ بن جانے سے قدیم بورڈ صحیح سالم اور صحت مند رہے گا۔ محض چند ناموں کا ورد کرنے سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی کہ قدیم بورڈ صحیح سالم ہے، ممکن ہے کہ وہ صحیح سالم ہو، ہماری دعا بھی یہی ہے، لیکن اگر اس ملت کے اندر سے ایسے گروہ پیدا ہوجائیں، جو متصادم قوتوں سے یک جا ہوکر اپنی جدو جہد جاری رکھ سکیں بلکہ کشتی میں سوراخ پیدا کرتے رہیں تو انجام بخیر نہ ہوگا۔

شیعہ پرسنل لا بورڈ ہو یا بریلوی پرسنل لا بورڈ دونوں کے اندر یہ شعور پیدا کرنا ضروری ہے کہ انتشار ہم سب کے لیے یکساں مضر ہے۔ اس کا تدارک ہم سب کی ذمے داری ہے، دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ الزامات اور شکایتوں پر ہم دردانہ اور غیر جانب دارانہ غور کیا جائے، اور اس کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے۔ دور حاضر کی ایک لعنت میڈیا پر نمایاں ہونے اور اس کی خرافات سے متاثر ہونے کا رجحان ہے، بدقسمتی سے میڈیا نہ تو ہمارے طرز فکر اور رجحانات سے واقف ہے اور نہ ان پر صحت مند اثرات ڈالنے سے دل چسپی رکھتا ہے۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ زبانی معرکہ آرائی سے بچا جائے اور خاموشی سے اس کینسر کا علاج کیا جائے، جو ہماری ملت کو رفتہ رفتہ حریفوں کا شکار بنا رہا ہے۔

اس موقعے پر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی ترجیحات کو دین حق کی ترجیحات کے تابع بنائیں۔ ہماری فکر ونظر کی صحت کا انحصار اس شعور کو گہرا کرنے پر ہے کہ ہم محض چند تاریخی واقعات کو اس امر کی اجازت نہ دیں کہ وہ ہماری شہ رگ پر ضرب کاری لگائیں، ملت کی اجتماعی قوت اس رواداری کو زندہ کرنے میں ہے کہ ہم عزاداری اور مدح صحابہ کے اختلاف کو برداشت کریں۔ اور دین کی بنیادی تعلیمات اور شریعت اسلامیہ کی بالا دستی کو اپنی غایت اولیٰ بنانے پر مرکوز کریں۔ فروعی مسائل میں اختلاف، شریعت اسلامیہ کی وسعت اور

عالم گیری کی دلیل ہے۔ اس کو رحمت قرار دینا ہی برکت کا موجب ہوگا۔ تنگ نظری اور بزعم خود صرف اپنی تعبیر میں حق کو محصور سمجھنا ضعف اور کمزوری کو دعوت دینا ہے، اس سے بغض و عناد جنم لیتے ہیں۔

عراق کے حالیہ انتخابات سے عام مسلمانوں نے اس گہری محبت کا اظہار کیا ہے، جو وہ شریعت اسلامیہ کی بالادستی سے رکھتے ہیں۔ ملکی نظام پر امریکہ کی شدید گرفت کے باوجود عراق کی شیعہ ملت نے بھی اسلام سے اپنی وابستگی کا ناقابل تردید ثبوت دیا ہے۔ یہ بات لائق شکر و احسان ہے کہ جب کبھی امت اسلامیہ کے عوام کو اپنی ترجیحات ظاہر کرنے کا موقع ملا ہے انھوں نے اسلام کے حق میں ہی اپنی رائے دی ہے۔ دنیا کی ظالم ترین حکومت بھی اس ترجیح کو بدل نہیں سکتی۔ اب ہمارے قائدین دانش ور اور علما کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اسلام کے اس سیلاب کی قدر پہچانیں، جو زیر زمین تو ہوسکتا ہے لیکن خشک نہیں ہوسکتا۔ دین حق میں جو پیغام مضمر ہے اس کی انسانیت دوستی اور صلح جوئی کو خود ہمیں بھی سمجھنا چاہیے، اور اسے دوسروں کو بھی سمجھانا چاہیے۔ مسالک اور فرقوں کے درمیان جاری رہنے والی ندیوں اور نالوں کو ایک بحر ذخار میں تبدیل کرنا ایک ایسا اہم چیلنج ہے، جس کے لیے خشیت الٰہی اور شعور فکر و نظر دونوں درکار ہیں۔

خلاصۂ گفتگو

الحمد للہ کہ ملت اسلامیہ ہند کے عوام اور خواص دونوں کو اس کا شعور ہے۔ قصور ہمارے علماء اور قائدین کا ہے کہ وہ اس مثبت رجحان سے فائدہ نہیں اٹھاتے، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ذاتی مفادات اور پرسنل شہرت دائمی دولت نہیں ہے، بلکہ ذرا سی آنچ لگنے سے دونوں پگھل جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ملت اسلامیہ کے درمیان انتشار اور نفرت و بعد، سیاسی کھیل کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ اصلاً تو یہ دین پیغام محبت دیتا ہے۔ اس دین کے حامل افراد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیں۔ وہ ہمیشہ دلوں کو

جوڑتے رہے ہیں۔ انسانیت کی تقسیم انھیں کبھی پسند نہیں رہی ہے، مگر ان کا مزاج اتنی سرعت سے بدل رہا ہے کہ وہ اپنی ہی جمعیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں دل چسپی لیتے ہیں، اس صورت میں ہم کس منھ سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں اونچے، نیچے، گورے، کالے، مشرق و مغرب سب کو ایک خدائے واحد کا بندہ بنا کر وحدت آدم کا سبق سکھانے کے لیے ہمارے رسول نے حکم دیا تھا۔ اگر ہم خود بنیان مرصوص نہ بن سکے، تو انسانیت عامہ کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کس طرح بچائیں گے؟
